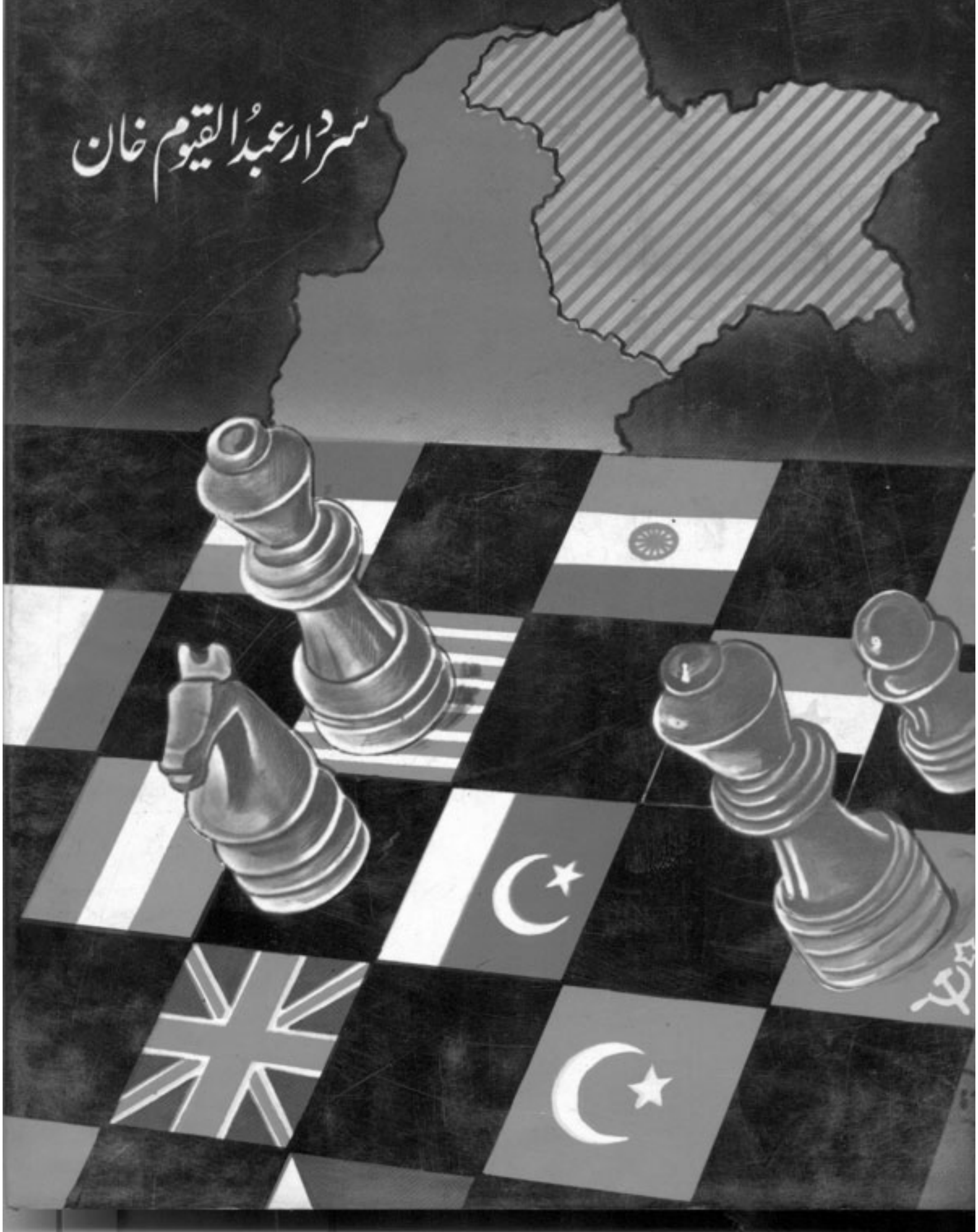
مقدمۂ کشمیر

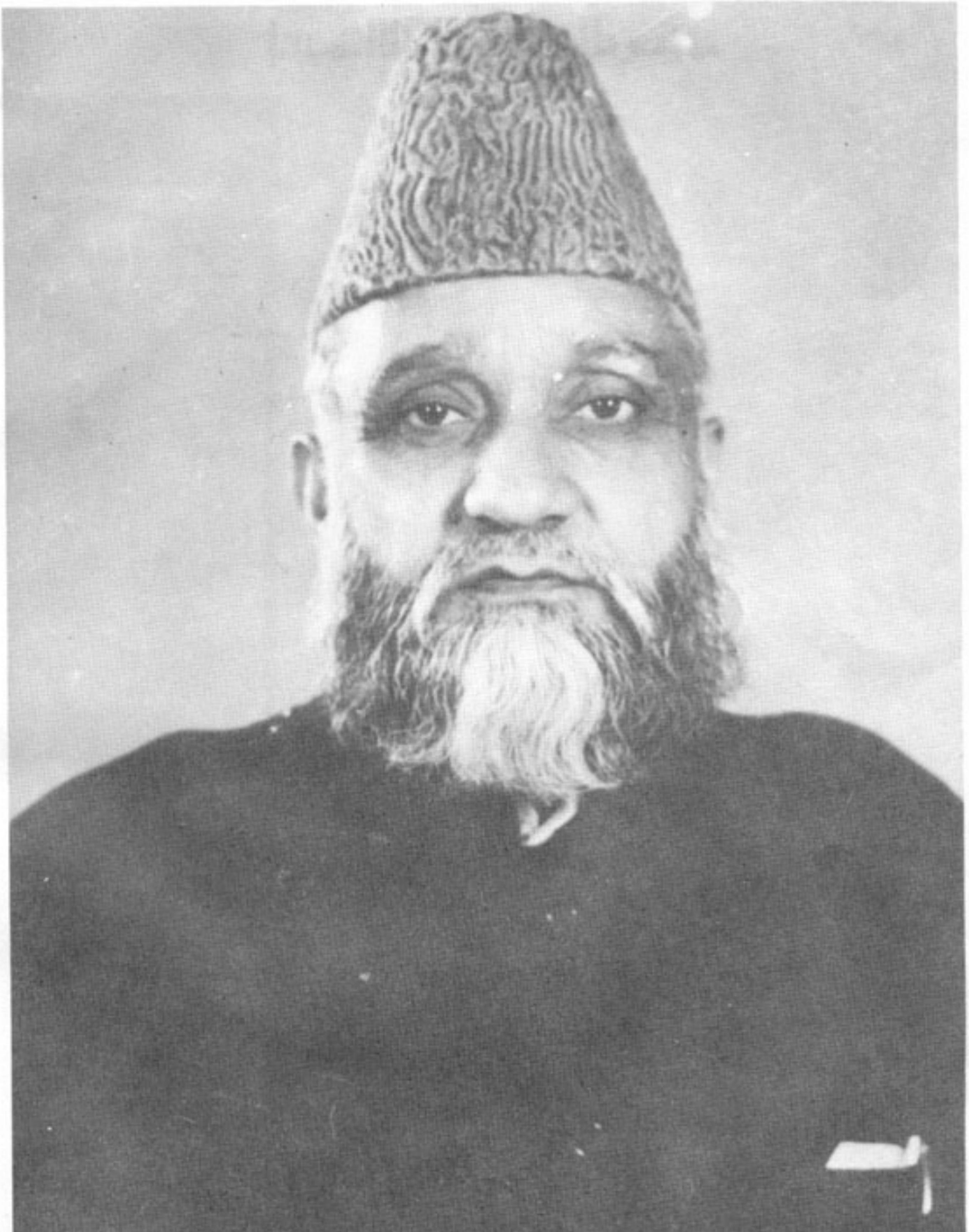
سردار عبدالقیوم خان



بسم اللہ الرحمن الرحیم



مقدمہ کشمیر



صاحبِ کتاب

مقدمۂ کشمیر

سردار عبدالقیوم خان

جنگ پبلشرز

پیش لفظ

برّصغیر پاک وہند کی آزادی کے بعد ریاستوں کے بھارت یا پاکستان کیساتھ الحاق کا معاملہ خصوصی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ دوسری ریاستوں کا معاملہ تو کسی نہ کسی طرح بجبر یا برضا طے ہو گیا لیکن ریاست جموں وکشمیر کے الحاق کا معاملہ بھارت کی پاکستان اور اسلامی دشمنی کے سبب آج تک حل نہ ہو سکا۔ تاہم ۱۹۴۷ء میں ریاست کے مجاہدین مسلح جہاد کے ذریعے ریاست کا کچھ حصہ آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئے جہاں اب آزاد کشمیر کے نام سے حکومت قائم ہے۔ ریاست کا باقی حصہ آزاد ہونے ہی والا تھا کہ بھارت سلامتی کونسل کے ذریعے ریاست میں استصواب رائے عامہ کے وعدے پر جنگ بند کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ چنانچہ یہ مسئلہ برسوں سلامتی کونسل میں گرما گرم بحثوں کا موضوع بنا رہا۔ کونسل نے ریاست میں استصواب کرانے کے لئے متعدد قراردادیں منظور کیں اور مصالحت کے ذریعے بھی اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن بھارت کی ہٹ دھرمی اور ضد نے کوئی کوشش کامیاب نہ ہونے دی۔ یہ حل طلب مسئلہ اس وقت بھی سلامتی کونسل کے ایجنڈے پر ہے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کچھ تو اپنی غفلت اور کچھ بھارتی پروپیگنڈے اور عالمی مصلحتوں اور سازشوں کے زیر اثر اس مسئلے کی اصل نوعیت اور حقیقت ہی بدلنا شروع ہو گئی اور نئی نسل کے ذہن متاثر ہونا شروع ہو گئے۔ جدوجہد آزادی کے صف اول کے کچھ لوگ اس دنیا سے رفتہ رفتہ رخصت ہو گئے اور باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔ ان میں سے بھی کچھ تو غم روزگار کی نذر ہو گئے اور کچھ مصلحتوں کا شکار۔ ان حالات میں اہم مسئلہ اور موضوع محروم التفات رہ گیا اور ملی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر آج تک کوئی کتاب منظر عام پر نہ آسکی۔ بالآخر۔

جز قیس کوئی اور نہ آیا بروئے کار

کے مصداق جدوجہد آزادی کے بطل جلیل مجاہد اول سردار محمد عبدالقیوم خان نے ہی یہ فریضہ انجام دیا اور حکومت وسیاست کی سنگین مصروفیات کے باوجود اپنی معلومات، تجربات اور افکار کو "مقدمہ کشمیر" کے عنوان سے کتابی صورت دی جو ہدیہ قارئین ہے۔

ویسے نہ تو موضوع کتاب غیر معروف ہے اور نہ صاحب کتاب کسی تعارف کے محتاج۔ البتہ کتاب کی اہمیت وافادیت اس اعتبار سے یقیناً بڑھ جاتی ہے کہ اسے ایسی شخصیت نے ترتیب دیا ہے جس نے زبان بندوق سے جدوجہد آزادی کا آغاز کیا، عنفوان شباب میدان کارزار میں گزارا اور ایک پختہ کار کامیاب

سیاستدان کی حیثیت سے اب تک قومی اور بین الاقوامی سطح پر اس تحریک کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ کئی مرتبہ وزارت وصدارت کے منصب پر فائز رہے اور کئی دفعہ صبرواستقلال کا کوہ گراں بن کر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ درحقیقت اس موضوع پر قلم اٹھانے کا حق بھی انہی کو پہنچتا تھا جو انہوں نے ادا کر دیا۔ ارباب وفا کا شیوہ اور شعار بھی یہی ہے ۔

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

کتاب میں اصل مسئلہ کے ساتھ صاحبِ کتاب کی زندگی کے اہم حالات و واقعات بھی درج ہیں جنہیں صاحب موصوف کی طرف سے مختلف مواقع پر سوالات کے جواب سے ترتیب دیا گیا ہے اس حوالے سے بعض دوسری اہم شخصیات کا ذکر بھی آ گیا ہے۔ ان کا ذکر اور ان کی تصاویر سے کتاب میں ایک دلچسپ اور مفید اضافہ ہے۔

امید واثق ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ ہر سلیم الفطرت اور محبت وطن انسان کے لئے مسئلہ کشمیر کو ملی نقطۂ نظر سے سمجھنے کے لئے کفایت کرے گا۔

خدا تعالیٰ ہمیں اس کتاب سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے

آمین

پروفیسر عبدالرزاق

ترتیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حالاتِ زندگی

جہادِ آزادی سے پہلے میری زندگی کے حالات کئی سالوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے بارے میں تفصیلی گفتگو کے لئے خاصا وقت چاہیئے۔ زیادہ بہتر اور مناسب یہ ہو گا کہ میرے اس وقت کے ہم عمر ساتھیوں سے یہ معلومات حاصل کی جائیں۔ ان کو بہت باتیں یاد ہوں گی۔ شاید اس وقت صرف چند باتیں جو میرے حافظہ میں ہوں ' بتا سکوں۔ میرے والد صاحب فوج میں ملازم تھے اور میں بچپن سے ان ہی کے ساتھ رہا' اس طرح مجھے بارہا اس علاقے میں جسے اب آزاد کشمیر کہتے ہیں ' رہنا پڑا۔ اس کے علاوہ مجھے اپنے والد کے ساتھ پشاور ' کوہاٹ 'پونا' اسکندر آباد اور حیدر آباد دکن میں بھی رہنے کا اتفاق ہوا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے مجھے گھر میں قرآن کریم پڑھایا۔ دوسرے استاد بھی تھے جو مجھے پڑھاتے تھے۔ میں نے اپنی والدہ محترمہ اور گھر کے دوسرے لوگوں سے سنا کہ جب چھ سال کی عمر میں مجھے سکول میں داخل کیا گیا تو اس وقت میں پورا قرآن کریم پڑھ چکا تھا۔ سکول میں قدرے دیر سے اس لئے داخل ہوا کہ میں والد صاحب کے ساتھ اپنے گھر سے باہر رہا۔ لیکن قرآن کریم کے پڑھنے کی مدد سے اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے دیر سے داخل ہونے کے سبب پڑھائی میں جو کمی ہوئی تھی ' وہ میں نے اس طرح پوری کی کہ جب میں ساتویں جماعت کا امتحان اسکندر آباد دکن دے آیا تو میرے والد مجھے پونچھ میں اس وقت کے بڑے مشہور و معروف ہیڈ ماسٹر ملک فتح محمد خان صاحب کے پاس لے گئے اور ان سے تقاضا کیا کہ وہ مجھے آٹھویں جماعت میں داخلہ دے دیں۔ لیکن انہوں نے یہ کہہ کر داخلہ دینے سے معذرت کی کہ میرے پاس ساتویں جماعت پاس کا سرٹیفکیٹ نہیں ہے تو میں نے ملک صاحب سے کہا کہ آپ میرا امتحان لے لیں اور مجھے جس جماعت کے قابل سمجھیں ' اس میں داخل کر لیں۔ اس بات سے وہ بہت خوش ہوئے۔ مجھے پونچھ بلایا۔ میں وہاں گیا تو نویں جماعت والوں کا ٹیسٹ ہو رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ یہ کیا ٹیسٹ تھا' شاید آخری ٹیسٹ تھا یا سالانہ ٹیسٹ۔ انہوں نے مجھے اس ٹیسٹ میں بٹھا دیا۔ مجھ

سے انہوں نے کچھ باتیں کیں، جن سے انہیں اندازہ ہوا کہ میں شاید نویں جماعت میں داخل ہونے کے قابل ہوں۔ میں نے وہ ٹیسٹ پاس کر لیا تو انہوں نے مجھے دوسرے لڑکوں کے ساتھ دسویں میں داخلہ دے دیا۔ اس طرح دو سال کی جو کمی تھی وہ پوری ہو گئی۔ کچھ تو مجھے خود پڑھنے کا شوق تھا اور کچھ والد صاحب کے ساتھ رہنے کے باعث ان کے سینئر افسروں اور انگریز اعلیٰ افسروں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے باعث مزید شوق پیدا ہوا۔

ملازمت اور سفر

میرے والد صاحب کی خواہش تھی کہ میں فوج میں ملازمت کروں۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ میں فوج میں چلا گیا۔ لیکن اس وقت چونکہ میری عمر ابھی کم تھی، اس لئے مجھے انہوں نے کمیشن نہیں دیا بلکہ مجھے کہا کہ تم دو تین سال سروس کرو، بعد میں جب کمیشن کے امتحانات ہوں گے تو تم کو کمیشن دیا جائے گا۔ اس طرح تھوڑے سے عرصے کے لئے میرا تعلیم کا وہ شوق باقی نہ رہا۔ فوج میں ایک انجینئرز یونٹ تھی جو ریلوے انجینئر تھے۔ میں اسی یونٹ میں شامل ہو گیا اور اس سلسلے میں مجھے جلد ہی ہندوستان سے باہر جانا پڑا۔ یہ تقسیم ملک سے پہلے کی بات ہے جب سارا ہندوستان متحد تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے ہم سوڈان گئے۔ وہاں سے حبشہ گئے اور حبشہ کے علاوہ ارٹیریا، اسمارا اور مساوہ میں رہے۔ اسی طرح ہم خرطوم میں بھی رہے۔ وہاں سے پھر مجھے کافی عرصہ فلسطین میں رہنے کا موقع ملا اور پھر ہم واپس وطن آ گئے۔

سکول کے زمانے اور فوج کی ملازمت کے تین سال کے عرصے میں بہت سے قابل ذکر واقعات شامل ہیں۔ میں نے ان واقعات کا سرسری طور پر ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد میں نے گھریلو ضروری معاملات کی وجہ سے فوج سے ریلیز لے لی اور گھر آ گیا۔ گھر میں جو تھوڑا سا عرصہ گزرا۔ اس عرصے میں ہم نے جہاد آزادی کی تحریک شروع کی۔ اس طرح پچھلا دور زندگی ختم کر کے جہاد آزادی تک پہنچے۔

ممالک غیر کے تجربات

میں نے ملک سے باہر جو زندگی گزاری، میں اس وقت اس زندگی کے کئی قسم کے اثرات محسوس کرتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے ورنہ اس وقت جب کسی چیز کا اثر مرتب ہو رہا ہو تو اس وقت اس کا احساس نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک بات یہ کہ والدہ اور والد دونوں کی طرف سے ہمارا گھرانہ بہت شدّت کے ساتھ دین دار گھرانا تھا۔ اولیاء کاملین کا ہمارے گھروں میں بہت آنا جانا تھا جو اپنے زمانے کے

بڑے جلیل القدر لوگ تھے، جن کے ہم نام ہی سن سکتے ہیں، ان جیسا کوئی دوسرا دیکھنے میں نہیں آیا، تو اس کا اثر بھی مجھ پر بہت تھا۔ مجھے بہت چھوٹی عمر سے جبکہ بچوں کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا، مجھے ذکر الٰہی کرنے کا شوق تھا۔ میں مختلف اوراد اور وظائف کچھ اپنے طور پر اور کچھ سن سنا کے پڑھتا رہتا تھا۔ ملک سے باہر کے سکولوں میں اور سکولوں سے باہر جو زندگی گزری، اس میں ایک قسم کی باہمی کشمکش چلتی رہی۔ کبھی یہ شوق جاری رہتا، کبھی کم ہو جاتا اور فضول شوق پیدا ہو جاتے۔ ایک وقت تو مجھ پر ایسی حالت طاری ہو گئی کہ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میں خدا کے وجود کے بارے میں بھی شک میں پڑ گیا ہوں۔ البتہ اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم ہے کہ اس سارے عرصے میں حضور نبی اکرمؐ اور حضرت غوث الاعظمؒ کے ساتھ عقیدت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ لیکن خدائے تعالیٰ کے وجود کے بارے میں مجھے شک ہونے لگا اور یہ نفسیاتی صورتحال اندر کی طلب اور تشنگی کو پورا کرنے کے لئے باہر سے کسی رہنمائی کے نہ ہونے اور غلط قسم کی مجالس کے سبب پیدا ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول کا یہی اثر ہو سکتا تھا۔ اس اثر سے تو انبیاء علیہ السلام ہی محفوظ رہ سکتے ہیں جن پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا۔ مگر اس کے باوجود اللہ کا یہ کرم ہے کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ بنیادی بات میرے اندر بدستور قائم رہی، جس نے مجھے مکمل طور پر خراب ہونے سے بچا لیا، بلکہ میری وجہ سے کئی اور بزرگ تھے جن کو میرے ساتھ رہنے کے باعث تھوڑا سا ٹھیک ہونے کا اور اصلاح کا موقع ملا۔ تو اس طرح یہ دورِ زندگی فلسطین اور دوسرے علاقوں میں گزرا۔ اس وقت وہاں کئی قسم کی آزادی کی تحریکیں چل رہی تھیں۔ مجھے اپنی جواں سالی کی اور افتادِ طبع کی وجہ سے ان تحریکوں میں کام کرنے والے نوجوان کارکنوں کے ساتھ رابطہ کرنے کا موقع ملا بلکہ اپنے مزاج اور طبیعت کے تقاضا کے باعث غیر شعوری طور پر ان کے ساتھ ایک رابطہ اور تعلق قائم ہوتا چلا گیا۔ خاص طور پر فلسطین میں اسرائیل کی جو تحریک چل رہی تھی اور جس کے نتیجہ میں "اسرائیل" معرض وجود میں آیا، اس کے ابتدائی جو نوجوان کارکن تھے، ان میں بہت سے لوگوں کے ساتھ میرے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ وہ کیا کرتے تھے، تربیت کیسے حاصل کرتے تھے، اسلحہ کیسے بناتے تھے، کہاں بناتے تھے، اس کو استعمال کس طرح کرتے تھے، یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن کا ان لوگوں کی وجہ سے مجھے خاصا علم تھا اور وہ بھی مجھ پر بہت اعتماد کرتے تھے اور مجھ سے باتیں چھپاتے بھی نہیں تھے۔ حالانکہ میرے دل میں فلسطینی مسلمانوں کے خلاف اس کارروائی کے ردِّعمل کے طور پر شدید جذبات بھی تھے۔ ہم فلسطینی نوجوانوں کو اکٹھا کر کے ان کو بھی سمجھاتے تھے کہ تم لوگ اپنا معاملہ ٹھیک کرو، ایسا نہ ہو کہ اسرائیلی تحریک تمہیں یہاں سے نکال ہی دے۔ ان فلسطینی مسلمانوں کے علاوہ عیسائیوں کے ساتھ بھی میرے بڑے گہرے مراسم اور تعلقات تھے، بلکہ ہم نے ان سازشوں کا مقابلہ کرنے کی بھی خاصی تیاری کی تھی جو اسرائیلی نوجوان ان مسلمانوں کے اخلاق کو تباہ کرنے کے لئے کر رہے تھے اور انہیں اس میں کافی حد تک کامیابی بھی حاصل رہی۔ اسی طرح باہر رہ کر مجھے فوجی معاملات دیکھنے سننے کا بھی موقع ملا، خیالات میں وسعت پیدا ہوئی۔ کتابیں پڑھنے کے شوق اور وہاں کے لوگوں کے ساتھ

میل ملاپ اور رابطہ کی وجہ سے میں نے پڑھنے پڑھانے کا کام بھی جاری رکھا۔ اپنے خیالات میں جو تھوڑی بہت وسعت میں اب محسوس کرتا ہوں، اس میں اس دور کی زندگی کا بھی بڑا دخل ہے۔

مجاہد اول کا لقب

مجھے اسلامی نقطۂ نگاہ سے تو مجاہد کی تعریف کرنے کی ضرورت اس لئے نہیں ہے کہ یہ بات معروف ہے کہ جو لوگ خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، اسلام کی سربلندی کے لئے لڑتے ہیں یا غیر مسلموں کے حملے کے خلاف اپنے دفاع میں لڑتے ہیں، مجاہد کہلاتے ہیں۔ مجھے جو لوگ مجاہد اول کہتے ہیں، اگرچہ میں نے ان سے کبھی نہیں کہا ہے کہ وہ مجھے مجاہد اول کہیں، لیکن خدا نے مجھے وہ سعادت دی ہے اور میں نے ہی ریاست جموں و کشمیر میں ڈوگرہ حکومت کے خلاف پہلی مسلح بغاوت کی سازش یا منصوبہ آپ اسے سازش کہیں یا منصوبہ کہیں، کی ابتدا کی تھی۔ اس وقت پورے متحدہ ہندوستان میں کسی مسلح جدوجہد کا کوئی تصور نہیں تھا، کیونکہ سیاسی تحریکیں چل رہی تھیں۔ لوگ سیاسی طور پر آزادی کے لئے بات کرتے تھے اور ریاست میں بھی جو تحریک چل رہی تھی، وہ سیاسی تحریک تھی۔ نیشنل کانفرنس کی بھی اور مسلم کانفرنس کی بھی۔ لیکن مجھے اس سلسلہ میں یہ شرف حاصل ہے۔ اگر یہ کوئی شرف ہے کہ ان کے خلاف مسلح بغاوت کرنے کا منصوبہ میں نے بنایا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہ بہت حد تک کامیاب بھی رہا۔ اس وجہ سے لوگوں نے خود بخود مجھے مجاہد اول کہنا شروع کیا۔

مجاہد اول اور جہاد

میرے معاملے میں تو یہ دونوں باتیں شامل ہیں کہ دعوت بھی میں نے ہی پہلے دینا شروع کی اور گولی چلانے کا شرف بھی مجھے ہی حاصل ہے۔ ڈوگرا فوج پر ریاست میں سب سے پہلے گولی جو چلی ہے، وہ اللہ کے فضل و کرم سے میں نے ہی چلائی تھی۔ البتہ ایک اور گولی بھی چلی ہے۔ اس دور میں ایک صاحب مولانا محمد بخش مرحوم تھے جنھوں نے ہڈاباڑی کے مقام پر فائر کیا لیکن وہ فائر انہوں نے یہ سمجھ کر کیا کہ کوئی ڈوگرا رات کو چھپ کر ہمارے فوج کے کیمپ میں آرہا ہے، مگر وہ ان کا اپنا ایک عزیز تھا جو رات کے اندھیرے میں آرہا تھا اور اس کو گولی لگ گئی تھی۔ پھر ہم نے ایک بھارتی فوجی دستے پر شبخون مارا جو ادھر سے دھیر کوٹ جارہا تھا۔ فائر میں نے کیا تھا۔ صرف میں ہی فائر کر سکا تھا۔ دوسرا کوئی گولی نہیں چلا سکا تھا۔ تو اس لحاظ سے اگر دیکھیں تو پہلی گولی جو فوج پر باقاعدہ طور پر چلی، وہ میرے ہاتھ سے چلی۔

پونچھ اور مظفر آباد کی آزادی

اصل میں یہ بات بڑی تفصیل اور وقت طلب ہے۔ یہ علاقے جب آزاد ہو گئے تو میں یکم جنوری ۱۹۴۹ء تک میدان جہاد میں مصروف جہاد رہا۔ یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو جب سیز فائر ہو گیا تو چند دنوں کے اندر میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ مجھے اب فوج کی قیادت چھوڑنا چاہئے کیونکہ اب یہ مسئلہ لمبا ہو گیا۔ یہ مسئلہ شاید اب سیاسی طور پر طے ہو گا۔ اب فوجی طور پر اس کے حل ہونے کا معاملہ رک گیا ہے یا کم از کم کافی عرصہ کے لئے ملتوی ہو گیا ہے۔ کچھ لوگوں نے اس وقت کوشش کی کہ ہم اس کو جاری رکھیں۔ لیکن میرا وجدان یہ کہتا تھا نیز مجھے تھوڑا بہت علم تھا کہ اگر ہم اس کو جاری رکھنے کی کوشش کریں گے تو ہمارے اپنے گھر میں تصادم ہو جائے گا اور یہ نوزائیدہ مملکت پاکستان اس تصادم کی متحمل نہیں ہو سکتی اور ہم کشمیر حاصل کرتے کرتے کہیں پاکستان سے بھی ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔ تو اس وجہ سے میں نے پھر فوج کی کمان چھوڑ دی اور سیاسی جماعت مسلم کانفرنس میں شامل ہو گیا۔ اس کے بعد پھر میں سیاسی سرگرمیوں میں مصروف رہا جو معروف و معلوم ہیں۔

۴ / اکتوبر کا اعلان صدارت

یہ امر واقعہ ہے کہ ۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جہاد کی بڑی شدت تھی۔ ہم لوگ اس وقت کہیں پونچھ کے قریب پہنچے ہوئے تھے، مجھے تو اس سے دلچسپی زیادہ نہیں تھی کہ پنڈی میں بیٹھے ہوئے لوگ جو جہاد میں شریک نہیں ہیں، کیا کر رہے ہیں، کیا نہیں کر رہے ؟ لیکن بعد میں ۲۴ اکتوبر کو جب حکومت بننے کا اعلان ہوا تو اس کے ساتھ ہی اس اعلان کا بھی زیر لب کہیں کہیں ذکر آتا رہا کہ کوئی اعلان ہوا ہے اور یہ تینوں آدمی انور شاہ، غلام نبی گلکار اور خورشید انور بھی اس وقت راولپنڈی کے حلقوں میں جانے پہچانے جاتے تھے، گلکار تو پنڈی میں یوں ایسے ہی بیٹھے ہوئے تھے اور وہ ریاست جموں و کشمیر میں قادیانی جماعت کے خلیفہ تھے۔ تو اس لئے یہ بھی عین ممکن ہے کہ قادیانی حضرات چونکہ ریاست میں بہت عرصہ سے ایک مرزائی ریاست بنانا چاہتے تھے، انہوں نے اس موقع کا فائدہ اٹھایا ہو اور اس کا اعلان کروایا ہو اور یہ سب باتیں اتنی قرین قیاس ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کو سچا یا جھوٹا کہہ سکتے ہیں۔ انور شاہ ہمارے بڑے تیز طرار کارکن تھے، وہ چمن کوٹ کے رہنے والے تھے، وہ بھی پیچھے رہنے والے نہیں تھے۔ ان کو اگر پتہ لگا ہو تو انہوں نے کہا ہو گا کہ میرا اعلان کروا اور اسی طرح خورشید انور نے ریاست میں باقاعدہ تاج پوشی کی تیاری کر لی تھی اور ایک ملکہ بھی مہیا کی تھی۔ ان ہی دنوں ان کی شادی بھی ہوئی تھی۔ اس طرح وہ مظفر آباد سے سری نگر کی طرف پیشقدمی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یوں یہ سب لوگ برابر کے دعویدار ہیں۔ یہ

سب غلط کہتے ہیں۔ مجھے کسی ایک کا دعویٰ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن میری نہ براہ راست معلومات ہیں، نہ میں نے کبھی دلچسپی لی ہے۔ بہرحال یہ باتیں میں نے اس وقت سنی جب میں محاذ پر تھا۔ مجھے اس سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے مری آتے جاتے تھے اور بس۔

قائد کشمیر کی آمد اور میری مصروفیات

جہاں تک میری مصروفیات کا تعلق ہے چوہدری صاحب جب تشریف لائے ہیں تو اس وقت میں ابھی فوج کی کمان کر رہا تھا۔ چونکہ وہ ۱۹۴۸ء کے شروع میں پاکستان تشریف لائے تھے۔ میں ابھی محاذ جنگ پر تھا اور فوج کی کمان کر رہا تھا۔ مجھے وقت یاد نہیں کہ وہ کس وقت تشریف لائے۔ چونکہ وہ بہت افراتفری کا زمانہ تھا لیکن مجھے یہ اچھی طرح یاد ہے کہ چوہدری صاحب جب دورے پر باغ تشریف لائے تو میں ابھی کمانڈر تھا بلکہ باغ میں ان کو میں نے اپنے ہیڈ کوارٹر میں ہی رکھا تھا اور یہ مجھے اس لئے بھی بڑی اچھی طرح یاد ہے کہ کچھ لوگ چوہدری صاحب سے ملنا چاہتے تھے۔ علیحدہ بھی اور اکٹھے بھی۔ مگر چوہدری صاحب مرحوم کو کھلا دربار لگانے کی عادت تھی۔ کھلے عام اکٹھے بیٹھتے تھے تو میں نے محسوس کیا کہ اس طرح لوگ ملاقات نہیں کر سکیں گے تو میں خود دروازے پر کھڑا ہو گیا اور لوگوں کو ایک ایک دو دو کر کے جس طرح ملنا چاہتے تھے ملایا۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ گزرا تو چوہدری صاحب نے مجھے بلایا کہنے لگے کہ تم کیا کر رہے ہو یہاں؟ میں نے کہا کہ لوگوں کو آپ سے ملا رہا ہوں۔ کہنے لگے میں تو اس قسم کی ملاقات کا عادی نہیں ہوں۔ میں نے انہیں مذاق کرتے ہوئے کہا کہ آپ آج فوجی کیمپ میں ہیں تو آپ کو فوج کے ڈسپلن کے ماتحت رہنا پڑے گا۔ جیسے میں کہتا ہوں ایسے ہی کیجئے۔ چنانچہ وہ دو تین چار گھنٹے بیٹھے رہے اور پھر جب لوگ مل چکے تو میں نے کہا اب آپ ان کے ساتھ کھلے دربار میں بیٹھیں اور جس طرح چاہیں گپ شپ کریں۔

چودھری صاحب اور میں

مجھے پوری طرح یاد نہیں پڑتا کہ ان کے ساتھ میری ملاقات باغ میں ہوئی یا راولپنڈی میں ہوئی۔ چونکہ ایک بڑی ملاقات ان کے ساتھ راولپنڈی میں ہوئی۔ ڈھیری حسن آباد ایک جگہ ہے، وہاں کسی مسلم لیگی رہنما نے کھانے کا اہتمام کیا تھا اس کھانے پر چوہدری صاحب کے ساتھ میری ملاقات ہوئی۔ غالباً وہ پہلی ملاقات تھی۔ جبکہ اس سے پہلے چوہدری صاحب کے ساتھ راولپنڈی میں ہی کسی مقام پر جہاں وہ ٹھہرے تھے یا ان کو ٹھہرایا گیا تھا، کسی میٹنگ میں ان کے ساتھ میرا تعارف ہوا تھا۔ لیکن مجھے یہ محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ چوہدری صاحب کے ساتھ یہ ہماری پہلی ملاقات ہو۔ مجھے ایسے لگتا تھا کہ جیسے ہم زمانے

سے اکٹھے رہے ہیں۔ مجھے کچھ زیادہ یاد نہیں ہے کہ ان کے ساتھ کس جگہ پہلی ملاقات ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ ان کے آنے کے فوراً بعد ہی یہ ملاقات ہوئی ہوگی۔

۱۹۵۰ء کا استعفاء

سلامتی کونسل کی قرارداد پر ۱۹۴۹ء میں جب جنگ بند ہو گئی' تو اس کے بعد راولپنڈی میں سیاسی سرگرمیاں بہت تیزی کے ساتھ شروع ہو گئیں۔ کچھ لوگ جہاد میں مصروف تھے۔ اس طرح کچھ لوگ جن کو جہاد میں دلچسپی نہیں تھی' انہوں نے راولپنڈی میں سیاسی سرگرمیاں بہت تیز کر دیں۔ ایسا لگتا تھا کہ بس اب قیامت آنے والی ہے۔ اس کے نتیجے میں ہمارے کچھ کارکن جو وادیٔ کشمیر سے آئے تھے اور وہ بڑے جذباتی ہونے کے علاوہ بڑی تکلیفیں اور پریشانیاں اٹھا کر وہاں سے نکلے تھے' پاکستان کی خاطر ان کو وہاں سے نکالا گیا تھا۔ وہ چونکہ زیادہ تعداد میں آنے شروع ہو گئے تھے تو وہ خاصے متحرّک ہو گئے تھے اور اس وقت کی وزارت امور کشمیر میں ان لوگوں نے کچھ ایسی صورتحال پیدا کر دی کہ انہی دنوں سردار ابراہیم اور قائد ملت چوہدری غلام عباس مرحوم کے درمیان ایک تصادم پیدا ہو گیا تھا۔ اس تصادم میں وادی سے آنے والے یہی ہمارے دوست بھی خاصے متحرک تھے۔ خاص طور پر ان کا ایک گروہ بڑا متحرک تھا جو چوہدری صاحب کے خلاف اور سردار ابراہیم خان کے حق میں تھا۔ انہوں نے ہمارے لئے پنڈی میں بڑی پریشانی پیدا کر لی تھی۔ وہ مسلم کانفرنس کے دفتر پر حملہ کرتے رہے۔ چنانچہ مسلم کانفرنس کے دفتر پر پولیس کا پہرہ لگوانا پڑا تھا۔ میں نے کانفرنس میں کچھ دیر رہنے کے بعد چوہدری صاحب سے کہا کہ آپ اس دفتر کا چارج مجھے دے دیں۔ اس وقت دفتر کا چارج سردار یار محمد خان مرحوم کے پاس تھا جو آزاد کشمیر میں ہائیکورٹ کے جج ہو کر ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ وہ مقبوضہ کشمیر کے رہنے والے تھے اور مسلم کانفرنس کے بڑے مخلص کارکن تھے۔ وہ مسلم کانفرنس کے جوائنٹ سیکرٹری تھے۔ دفتر کا چارج ان کے پاس تھا' تو میں نے چوہدری سے کہا کہ دفتر کا چارج مجھے دیں تا کہ ہم پولیس کو یہاں سے ہٹا دیں اور دفتر معمول کے مطابق کام کرے۔ یہ بڑی بدنامی ہے' اس لئے کہ ہم پاکستان میں پنجاب میں بیٹھے ہیں اور دفتر پر پولیس کا پہرہ لگا ہوا ہے۔ یہ اچھا نہیں لگتا۔ تو وہ کہنے لگے کہ تم یہ کیسے کرو گے؟ میں نے کہا کہ آپ یہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ آپ اس کا چارج مجھے دے دیں۔ انہوں نے یار محمد خان کو بلوا کر کہا کہ تم پندرہ دن کی چھٹی پر چلے جاؤ اور چھٹی کے دوران مجھے کہا کہ تم جاؤ اور جا کے جوائنٹ سیکرٹری کی حیثیت سے وہاں کام کرو۔ چنانچہ میں دفتر میں چلا گیا۔ دفتر کے اندر بھی ایک لڑاکا گروپ موجود تھا۔ سب سے پہلے تو میں نے باہر پولیس انچارج کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ آپ لوگ یہاں کیا کرتے ہیں! وہ کہنے لگے کہ ہم پہرہ دے رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔ انہوں نے کہا کہ نہیں' آپ آئی جی سے یا ڈی آئی جی سے کہیں۔ میں

نے کہا کہ میں کسی سے نہیں کہوں گا۔ میں تم کو لکھ کر دیتا ہوں کہ تمہاری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ ہمارا دفتر ہے۔ آپ لوگ یہاں سے چلے جائیں۔ چنانچہ وہ وہاں سے چلا گیا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے اندر جو لڑا کا گروپ تھا' اس کو بلوایا۔ وہ جماعت کے ملازم تھے۔ تو میں نے ان سے پوچھا کہ تم میں جنھوں نے سیاست کرنا ہے وہ ایک طرف ہو جائیں اور جنھوں نے ملازمت کرنا ہے وہ دوسری طرف۔ ان میں کچھ تھے جنھوں نے کہا کہ ہم تو سیاست کریں گے۔ تو میں نے اکاؤنٹنٹ کو بلوا کر کہا کہ ان کے پیسوں کا حساب کر کے ان کو فارغ کرو۔ یہ دفتر سے چلے جائیں اور باہر جا کر سیاست کریں اور جنھوں نے ملازمت کرنا ہے وہ ادھر بیٹھیں۔ چنانچہ اس طرح ہم نے وہاں پر نظام بحال کیا۔ پھر اس کی ایک لمبی داستان ہے کہ دفتر کے باہر کیا ہوا۔ بہر حال اس وجہ سے کچھ دن مجھے مسلم کانفرنس کا جوائنٹ سیکرٹری رہنا پڑا۔ تو وہ تو چونکہ کوئی باقاعدہ عہدہ تھا نہیں' میں تو ایک چھٹی کے انتظام میں خود کہہ کر وہاں گیا تھا۔ اس لئے جب یار محمد صاحب واپس آئے تو میرا جوائنٹ سیکرٹری کا عہدہ خود بخود ختم ہو گیا۔

میاں افتخار الدین کی سیاسی پارٹی اور استعفاء

یہ صحیح نہیں ہے کہ میں بائیں بازو کی پارٹی میں شامل ہوا تھا۔ میاں صاحب کے ساتھ ہمارے تعلقات اس وقت بننا شروع ہوئے تھے جب یہ تحریک ۱۹۴۷ء کے ابتدائی دور میں تھی یعنی میاں افتخار الدین کے ساتھ ہمارے تعلقات اس تحریک کے ابتدائی زمانے سے بننا شروع ہوئے تھے' بلکہ وہ شاید سری نگر گئے تھے۔ ان دنوں ان کے تعلقات چونکہ کانگریس اور مسلم لیگ کے ساتھ بھی تھے۔ ۲۴ اکتوبر کو آزاد حکومت بنی تو اعلان کے وقت تک یہ تعلقات برقرار رہے۔ ان کے ساتھ ویسے ہی میری جواں سالی اور طبیعت کی تیزی کی وجہ سے تعلق بن گیا تھا۔ شاید میری افتاد طبع اور تیزی و طرّاری کے پیش نظر کئی لوگوں کو یہ احساس یا شک ہوتا تھا کہ میرا جھکاؤ بائیں بازو کی طرف ہے۔ بائیں بازو کے کئی لوگوں کے ساتھ میرے تعلقات بھی تھے جو بڑے دلیر اور نامور سمجھے جاتے تھے۔ یہ ملک سے باہر بھی تھے اور ملک کے اندر بھی' اور اس وجہ سے یہ خیال عام ہو گیا ہو گا کہ شاید میں ان کی پارٹی میں شامل ہوا ہوں۔ ورنہ میں ان کی پارٹی میں بالکل شامل نہیں ہوا تھا' البتہ یہاں ہم نے ایک آزاد پارٹی جو انہوں نے وہاں بنائی تھی' اسی نام کی ایک پارٹی میں نے یہاں بنائی تھی اور یہ وہ وقت تھا جس وقت ہم سیز فائر لائن کو توڑنے اور جہاد آزادی کو دوبارہ شروع کرنے کی تیاری کر رہے تھے' جس میں جنرل اکبر خان کی سازش بھی آتی ہے۔ یہ اس دور کا واقعہ ہے۔ وہ آزاد پارٹی میں نے بائیں بازو کی وجہ سے نہیں بنائی تھی بلکہ اس لئے کہ مسلم کانفرنس ایک معروف روایتی سیاست کی پابند تھی اور وہ اس قسم کا کوئی خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں تھی۔ میں نے خود ایبٹ آباد جا کے قائد ملت چوہدری غلام عباس مرحوم کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ ہم ایسا کرنا چاہتے

ہیں۔ اگر یہ کوشش کامیاب ہو گئی تو اس کو آپ مسلم کانفرنس کا کارنامہ سمجھیں اور ناکام ہو گئی تو یہ ناکامی میرے اپنے ذمے لگے گی اور مسلم کانفرنس اس ذمہ داری سے بچ جائے گی۔ چوہدری صاحب مرحوم نے اس کے ساتھ اتفاق نہیں کیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ کوئی بڑا خطرے کا کام ہے جو تم کرنا چاہتے ہو۔ لیکن اگر تمہاری ایسی مرضی ہے تو جیسے تم پسند کرو، ہم اس میں شریک نہیں ہو سکتے۔ تو اس خطرے کی پیش بندی کے طور پر ہمیں نئی پارٹی کے نام سے ایک تنظیم قائم کرنا پڑی۔ ورنہ ہمارے وہم و گمان میں بھی مسلم کانفرنس کو چھوڑ کر کسی دوسری سیاسی پارٹی بنانے کا خیال نہ تھا۔ اس سے شاید یہ تاثر پیدا ہوا ہو گا کہ میں میاں افتخار الدین کی بائیں بازو کی پارٹی میں شامل ہوں اور واقعہ یہ ہے کہ میں اس پارٹی میں قطعاً شامل نہیں ہوا تھا۔

مسلم کانفرنس میں میرا کردار

اصل میں چوہدری صاحب کو منظر سے ہٹانے کی کوششیں یکم جنوری ۱۹۴۹ء سے شروع ہو گئی تھیں۔ وہ اتنے طاقتور شخص تھے کہ اگر ان کو ہٹایا نہ جاتا یا ان کو کمزور نہ کیا جاتا تو کشمیر کی تحریک آزادی کو کمزور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہاں چونکہ قائداعظمؒ کی آنکھ بند ہوتے ہی بیوروکریسی کا دخل بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ کچھ بیوروکریسی کے لوگ ایسے تھے جو سمجھتے تھے کہ بھارت اپنا وعدہ پورا کرے گا۔ وہ کشمیر میں استصواب کروائے گا۔ کچھ شکست خوردہ لوگ تھے، کچھ سمجھتے تھے کہ بھارت کے ساتھ ہم لڑ ہی نہیں سکتے، جو ہو گیا سو ہو گیا، اسی پر بس اکتفا کرنا چاہئے، اس کے لئے چوہدری صاحب کو راستے سے ہٹانا بہت ضروری تھا۔ ان کے خلاف وزارت امور کشمیر میں جو سب سے پہلا کام شروع ہوا، وہ چوہدری صاحب اور سردار ابراہیم خان کے مابین اختلافات پیدا کرنا تھا اور انہیں آپس میں متصادم کرنے کا تھا۔ تو اس طرح چوہدری صاحب نے اس بات سے مایوس ہو کر سیاست سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ لیکن پھر ۱۹۵۳ء میں حالات ایسے ہوئے کہ چوہدری صاحب واپس سیاست میں لائے گئے، جس کے لئے وہ سٹیئرنگ کمیٹی بنائی گئی جس کا میں بھی ایک رکن تھا۔ میں نے پوری کوشش کی کہ مسلم کانفرنس کو جو کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی تھی، پھر دوبارہ منظّم کریں اور خدا کے فضل و کرم سے ہم نے اس کو خاصا منظّم کیا اور اس کے لئے بڑی دوڑ دھوپ کی۔ اس وقت مسلم کانفرنس کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہ پنڈی میں جلسہ نہیں کر سکتی تھی، نہ میٹنگ بلا سکتے تھے بلکہ کہیں بھی کچھ اور نہیں کر سکتے تھے پونچھ میں بڑا ہنگامہ تھا۔ سارے آزاد کشمیر میں ہنگامہ تھا۔ تو اب یہ کہنا کوئی تامّل نہیں ہے۔ اللہ کے فضل سے اس سارے ہنگامے کا مقابلہ مسلم کانفرنس نے جہاں جہاں کیا، اس میں میرا بہت نمایاں حصہ تھا اور ہمارے موجودہ وزیراعظم سردار سکندر حیات خان کے والد

سردار فتح محمد خان صاحب کا بڑا حصہ تھا۔ اصل میں ہم دونوں زیادہ تر آپس میں صلاح مشورہ کر کے کام کرتے تھے۔ وہ بھی اس وقت بڑے تنومند اور صحت مند تھے اور بڑے تیز و طرار شخص تھے اور قائد ملّت چوہدری غلام عباس مرحوم کے بڑے جانثار ساتھیوں میں سے تھے۔ باقی تو کئی لوگ سیاسی مصلحتیں بھی رکھتے تھے۔ لیکن یہ ایسے شخص تھے جن کو میری طرح مصلحتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور ہمیں جو حکم ملتا تھا، ہم جماعتی تقاضا سمجھ کر اس کو پورا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ تو اس طرح ہم نے اس اسٹیئرنگ کمیٹی کے ذریعے مسلم کانفرنس کو دوبارہ منظم اور فعال بنانے کی کوششیں کیں جو بہت حد تک کامیاب ہوئیں۔

۱۹۵۳ء میں برطرفی اور گرفتاری

میں ۱۹۵۲ء میں کرنل شیر احمد خان کی حکومت میں وزیر جنگلات تھا۔ اس وقت ہماری کوشش یہ تھی کہ ہم اس محاذ جنگ کا دوبارہ آغاز کریں اور یہ کام کشمیریوں کی اپنی طرف سے ہونا چاہئے۔ اس کے ڈانڈے پھر اسی جنرل اکبر خان کی سازش سے جا کر ملتے تھے۔ اس سازش میں بھی میرا ایک کردار تھا۔ حکومت پاکستان نے جان بوجھ کر اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ یہ مصلحت تھی کہ میرا ذکر نہ کیا جاتا، بلکہ مجھے گرفتار کرنے کی بھی کوشش کی گئی تھی لیکن مجھے گرفتار نہ کیا جا سکا بلکہ میں منسٹر ہو گیا۔ اس اثناء میں حکومت بنی جس میں کرنل شیر احمد خان ایک قسم کے Compromising Candidate (مصالحتی امیدوار) کے نقطہ نظر سے بیچ میں لائے گئے۔ اصل میں وہ ایک ایسا حادثہ ہو گیا تھا کہ ہم جو تیاری کر رہے تھے، اس کے لئے وقت بہت تھوڑا تھا۔ لوگوں کی فکر اور ان کے خیال کے ساتھ تو اتفاق تھا لیکن ان کے طریقہ کار کو ہم قائم نہ رکھ سکے اور اس رازداری کو ہم قائم نہ رکھ سکے۔ ان دنوں افراتفری اور جلدی میں کچھ باتیں ایسی ہو گئیں جن کی وجہ سے حکومت پاکستان کو قبل از وقت معلوم ہو گیا کہ ہم ایسا کر رہے ہیں، تو انہوں نے پہلے تو یہ کوشش کی کہ میں مستعفی ہو جاؤں۔ جب تلخی بہت بڑھ گئی تو حکومت نے چوہدری صاحب سے میرے متعلق کہا کہ "آپ اس سے استعفاء لے لیں، ہمارے کہنے سے تو یہ مستعفی نہیں ہو گا" تو انہوں نے ثناء اللہ شمیم کو میرے پاس بھیجا۔ میں نے کہا کہ اگر چوہدری صاحب کا حکم ہے تو استعفاء فوراً لے لو۔ یہ سب حیران ہوئے۔ انہیں اس کا خیال نہیں تھا کہ یہ آدمی ایسا کرے گا۔ میں یہاں سے رات کو پھر نکل گیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ کوئی گڑبڑ کریں گے اور ہمارے کچھ لوگ ایسے نڈر جانباز اور جانثار تھے کہ جن کے بارے میں میرا خیال تھا کہ آپس میں گولی کا تبادلہ نہ ہو جائے، اس سے نقصان ہو جائے گا۔ چنانچہ میں رات کو یہاں سے چناری کے راستے پر سران کے قریب سے گزرتے ہوئے نکل گیا۔ لیکن ہمارے نکلنے کی اطلاع چونکہ سب کو ہو گئی تھی، اس لئے پولیس نے آگے جا کے ہمیں گھیرے

میں لے لیا اب ہمارے لئے دو ہی راستے تھے۔ ایک یہ کہ ہمارے پاس جو تھوڑا بہت اسلحہ تھا، ہم فائر کرتے۔ پولیس والے بھی بے چارے گھبرائے اور ڈرے ہوئے تھے، تو ہم وہ بھی کر سکتے تھے، لیکن ہمیشہ جیسے میرا خیال رہا ہے کہ اپنے ہاتھ سے کسی مسلمان کا خون نہ گرایا جائے، تو میں نے اپنے لوگوں کو منع کیا کہ فائر نہ کریں۔ مولوی محمد بخش صاحب مرحوم بڑے تیز و طرار تھے، انہوں نے کہا کہ میں فتویٰ دیتا ہوں کہ یہ جہاد ہے، لیکن میں نے کہا کہ نہیں یہ جہاد نہیں ہے، ہم گولی نہیں چلائیں گے اور اپنے ہتھیار ان کو دے دیں گے۔ وہ بے چارے اتنے تھکے ہوئے تھے کہ ہمارے سارے ہتھیار رکھ کر سو گئے۔ پھر مجھے کسی نے کہا کہ ان کے ہتھیار بھی لے کر یہاں سے چلتے ہیں۔ ہم یہ کر سکتے تھے لیکن چونکہ ہمارا مقصد وہ نہیں تھا کہ آپس میں کوئی جنگ ہو، اس لئے میں نے اس سے اجتناب کیا اور اس طرح میں گرفتار ہو گیا۔ تو میرا خیال ہے کہ مظفر آباد کے اوپر کوئی جگہ رینوار شریف تھی، جہاں مجھے میرے ساتھیوں سمیت قید کیا گیا تھا۔

رہائی کے بعد کا کردار

سچی بات ہے کہ مجھے تمام باتیں تاریخ وار یاد نہیں ہیں، نہ ہی ان کی تفصیل یاد ہے حالات یہ تھے کہ پونچھ میں ۱۹۵۵ء میں خاص طور پر بڑی خاصی پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ لیکن اس سے پہلے ۱۹۵۲ء، ۱۹۵۳ء اور ۱۹۵۴ء کا سارا عرصہ بڑی سخت قسم کی تلخی کا زمانہ تھا۔ سردار ابراہیم خان صاحب سارے آزاد کشمیر میں ایک ایجی ٹیشن کر رہے تھے۔ اس کا زیادہ اثر پونچھ میں تھا اور لوگ ایک طرح بغاوت کرنے پر آمادہ تھے۔ اس طرح کی صورتحال پیدا ہو رہی تھی اور کرنل شیر احمد خان اس سلسلہ میں خود کوئی زیادہ مؤثر کردار ادا نہیں کر سکتے تھے۔ میں آزاد کشمیر میں اور پونچھ کے اکثر و بیشتر علاقوں میں دورہ کرتا رہا۔ لوگوں کو سمجھاتا رہا کہ اس قسم کی صورتحال پیدا نہ کریں۔ لیکن بدقسمتی سے ایسے حالات پیدا ہوئے کہ فوج اور ہمارے لوگوں کے درمیان گولی چلی جس میں لوگ زخمی بھی ہوئے کچھ گرفتار بھی ہوئے۔ اصل میں ۱۹۵۵ء کے زمانے کے تفصیلی حالات ایک علیحدہ مستقل نشست کا تقاضا کرتے ہیں کہ اس دور میں کیا صورت تھی؟ میرا رول اس میں زیادہ تر یہی تھا کہ لوگوں کو اس غلطی سے روکنے کی کوشش کی جائے۔ مجھے اس میں بہت حد تک تو کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن بعض علاقوں میں خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی۔ پھر ۱۹۵۵ء میں جب پنجاب سے یہاں آزاد کشمیر میں پولیس منگوائی گئی اس نے یہاں جو کچھ کیا، وہ تاریخ کا ایک بدنما داغ ہے۔ آزاد کشمیر میں جو کچھ ہوا اس کو درست کرنے میں بھی زیادہ تر قائد ملت چوہدری غلام عباس کا اپنا ذاتی اثر و رسوخ اور تھوڑی بہت میری مشقت تھی۔ ہم نے کوشش کر کے اس کو درست کیا، ان تلخیوں کو کم کیا، حکومت پاکستان کو تلخیوں سے روکا۔ حکومت پاکستان کو تاثر یہ دیا

جارہا تھا کہ پونچھ میں جو حالات ہیں یہ خدانخواستہ سیز فائر لائن سے اس طرف دشمن کے پیدا کردہ ہیں۔ ان کو اس قسم کی رپورٹیں دی جارہی تھیں جن کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ وہ اصل میں سردار ابراہیم خان صاحب کی غلط سیاست کا نتیجہ تھا جس سے پونچھ میں یہ حالات پیدا ہوئے۔ پھر ۱۹۵۶ء میں جب میں پھر صدر ہو گیا تو پھر مجھے زیادہ موقع ملا کہ میں ان تلخیوں کو کم کروں بلکہ ختم کروں۔ چنانچہ وہ لوگ جو قید تھے، وہ بھی بڑی بری حالت میں تھے۔ ان کو میں نے رہا کیا اور ان علاقوں کا دورہ کیا جن علاقوں میں یہ پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ جن کا نقصان ہو گیا تھا اور جن کے مکانات جلا دیئے گئے تھے ان کو معاوضہ تو نہیں دیا، البتہ ان کی دلجوئی اور اشک شوئی کے لئے میں نے انہیں تھوڑے بہت پیسے دیئے۔ حکومت پاکستان کو بھی اس بات کا یقین دلایا اور واقعات سے ثابت کیا کہ اس میں دشمن کا یا کسی اور کا کوئی ہاتھ نہیں بلکہ یہ ایک مقامی سیاست کی بات ہے۔ اس طرح میں نے صورتحال کو ٹھیک کیا۔ اسی دوران میں متاثرہ علاقوں کا دورہ بھی کرتا رہا۔ پلندری گیا، میرا ارادہ بارل جانے کا تھا۔ بارل میں ہی فوج اور لوگوں کے درمیان زیادہ گولی چلی تھی۔ وہ ان لوگوں کا ایک طرح کا بیس کیمپ یا قلعہ سمجھا جاتا تھا جن کا فوج کے ساتھ جھگڑا ہوا تھا۔ تو مجھے وزارت امور کشمیر نے بہت زور لگایا اور بار بار ٹیلیفون کئے کہ میں بارل نہ جاؤں، لوگ مجھے گرفتار کر لیں گے اور حکومت کو بہت بڑا ملٹری آپریشن کرنا پڑے گا۔ سچی بات ہے وہ مجھے ڈراتے رہے لیکن معلوم نہیں مجھے اپنے لوگوں پر کیوں بہت اعتماد رہا ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ لوگ اس وقت میرے ساتھ نہیں تھے بلکہ میرے مخالف تھے لیکن مجھے کبھی ایسا نہیں لگا کہ وہ خدانخواستہ میرے خلاف کوئی کارروائی کریں گے یا کوئی ایسی بیہودہ بات کریں گے۔ تو میں نے رات کو بارل اور اس کے گردونواح سے تعلق رکھنے والے تمام لوگوں کو جو وہاں موجود تھے، خصوصاً سدھن برادری والوں کو جمع کیا اور ان کے لیڈروں سے، جو ۲۰، ۲۵ یا ۳۰ آدمی ہوں گے، کمرہ بند کر کے کہا کہ آپ بتائیں کہ اگر آپ پاکستان کے خلاف لڑنا چاہتے ہیں تو ہم مل کر لڑیں اور اس کا سبب بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ کیوں پاکستان کے خلاف لڑیں؟ آپ مجھے اصل بات بتائیں، میں یہاں ہوں اور آپ کے ساتھ صدارت والی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم بالکل بھائیوں کی طرح ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے کہا کہ ہمارا پاکستان کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ ہم پاکستان سے کیسے لڑ سکتے ہیں۔ ہمارے لوگوں نے ۱۹۴۷ء کے جہاد میں پاکستان کے لئے اپنی جانیں دی ہیں اور یہ علاقہ آزاد کروایا ہے۔ پاکستان سے ہمیں کوئی شکایت نہیں ہے بلکہ وہاں راولاکوٹ کے کچھ ساتھی بیٹھے ہوئے تھے تو ایک آدمی نے بڑی تلخی سے برا بھلا کہہ کے کہا کہ یہ راولاکوٹ والے جو ایسے ویسے ہیں، انہوں نے ہمیں اُکسایا اور لڑایا کہ ہماری یعنی سدھنوں کی حکومت چلی گئی ہے اور تم لوگ لڑو۔ تو ہم لوگ لڑ پڑے۔ ہمارا حکومت پاکستان کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ خیر میں نے ان کو سمجھایا۔ میں نے کہا کہ آپ ایسا نہ کریں۔ میں دوسرے دن پھر چلا گیا۔ وزارت امور کشمیر نے منع کیا کہ آپ ایسا نہ کریں۔ میں وزارت امور کشمیر کے منع کرنے کے باوجود دوسرے دن پھر وہاں چلا گیا۔

لوگوں نے بہرحال بڑا استقبال کیا۔ جگہ جگہ گیٹ بنائے اور خدا نے کیا کہ وہ آگ یکلخت بجھ گئی۔ اس طرح ۱۹۵۲ء سے لے کر ۱۹۵۵ء تک کا جو زمانہ ہے اس میں رہائی کے بعد میں مسلسل اس کام پر لگا رہا۔

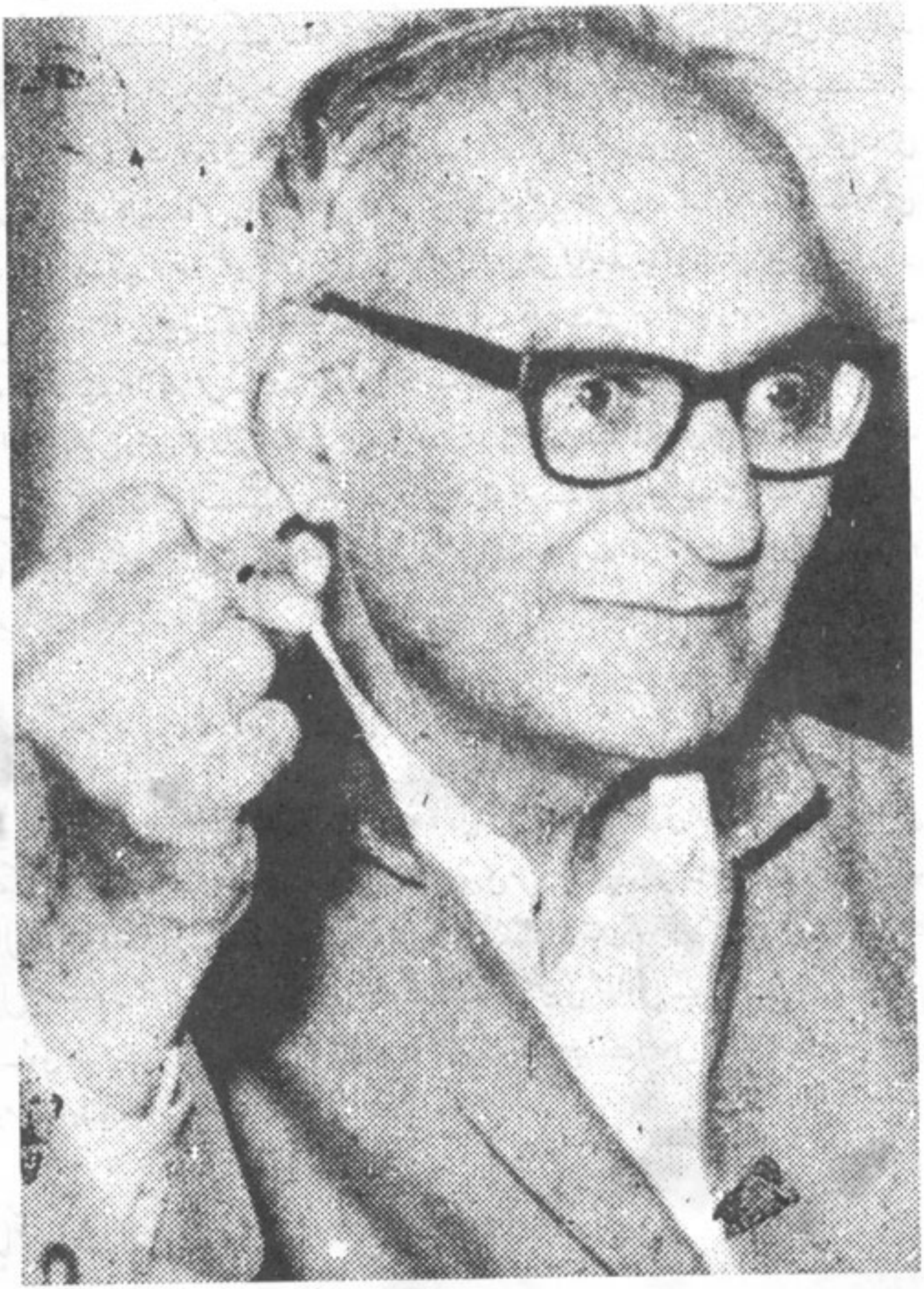
سہروردی سے اختلافات

حقیقت یہ ہے کہ مجھے تاریخ وار یاد نہیں پڑتا کہ آل پارٹیز کشمیر کانفرنس جس میں نہ صرف میں شریک ہوا تھا بلکہ وہ کانفرنس زیادہ تر قائد ملت چوہدری غلام عباس مرحوم کے کہنے پر ہی بلائی گئی تھی اور اس وقت ضرورت بھی تھی۔ چونکہ چوہدری محمد علی پرائم منسٹر تھے۔ وہ کشمیر کی ساری صورتحال پر اور آزاد کشمیر کے حالات کو درست کرنے کے لئے پاکستان اور آزاد کشمیر کے لوگوں کا نقطۂ نظر معلوم کرنا چاہتے تھے جس کے لئے یہ کانفرنس کراچی میں منعقد ہوئی تھی جس میں مسلم کانفرنس کے ساتھ میں بھی بطور مندوب شریک تھا۔ میں نے وہاں مختصر سی تقریر بھی کی تھی۔ تو اس کانفرنس میں سہروردی مرحوم اور سردار ابراہیم خان نیز یہ تمام لوگ جن کے ساتھ اس وقت ہمارا اختلاف تھا۔ ' آزاد کشمیر میں ایک منتخب جمہوری حکومت قائم کرنے پر زور دے رہے تھے اور ہم یہ کہہ رہے تھے کہ انتخابات منعقد کرانے سے تحریک آزادی کشمیر کو نقصان پہنچے گا۔ تحریک کا تقاضا یہ ہے کہ مسلم کانفرنس جو اس وقت واحد سیاسی جماعت تھی ان کی ورکنگ کمیٹی آزاد کشمیر کے اندر حکومت کو نامزد کرے گی تاکہ آزاد کشمیر کے انتخابات کی افراتفری میں تحریک آزادی ختم ہی نہ ہو جائے بلکہ مسلم کانفرنس میں تو یہ صورت بھی تھی کہ ہم خود مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل کے انتخابات نہیں کروا رہے تھے اس خیال سے کہ مسئلہ کشمیر پر ہمارے بین الاقوامی معاملہ پر حکومت پاکستان کا مؤقف یہ تھا کہ الحاق پاکستان کی قرارداد مسلم کانفرنس جنرل کونسل نے پاس کی ہے جو اس ساری ریاست کے مسلمانوں کی نمائندہ ہے۔ تو اس لئے کشمیر پر پاکستان کا دعویٰ ہے۔ اگر ہم جنرل کونسل بدل دیتے تو پھر پاکستان کا وہ دعویٰ قائم نہیں رہتا تھا۔ اس وجہ سے جنرل کونسل کے افراد بھی وہی رکھے گئے تھے بلکہ لیاقت علی خان مرحوم کا بھی یہی خیال تھا کہ ہم جنرل کونسل میں بھی کوئی تبدیلی نہ کریں' ورنہ ہمارا کیس خراب ہو جائے گا۔ تو دوسری طرف سردار ابراہیم اور یہ لوگ انتخابات پر زور دے رہے تھے۔ ان کی قیادت خاص طور پر سردار ابراہیم خان کر رہے تھے اور سردار ابراہیم خان اس وقت آزادی کے ہیرو تھے۔ اس وجہ سے لوگ ان کا ساتھ دے رہے تھے تو وہ مسلم کانفرنس کے خلاف تھے۔ ہمارا خیال یہ تھا' واللہ اعلم' شاید ان کی نیت بالکل ٹھیک ہوئی ہو گی' مگر ہمارا خیال یہ تھا کہ وہ مسلم کانفرنس کو شکست دینے کے لئے انتخابات کا مطالبہ کریں گے جس میں وہ جیت جائیں گے اور مسلم کانفرنس کو شکست ہو جائے گی۔ ہمارا نقطۂ نظر بالکل اور تھا۔ ہم اس فتح و شکست پر یقین نہیں رکھتے تھے بلکہ ہمارا خیال تھا کہ اس سے ہماری ساری تحریک پر برا اثر پڑے گا اور آزاد کشمیر کا یہ علاقہ



حسین شہید سہروردی

بجائے تحریک کا بیس کیمپ ہونے کے یہ ایک ایسا طے شدہ علاقہ بن جائے گا جس میں جمہوریت ہے، انتخابات ہوتے ہیں، حکومتیں چلتی ہیں، سب اس جھمیلے جھگڑے میں لگے رہتے ہیں۔ اس طرح اس کانفرنس نے پھر یہی فیصلہ کیا کہ یہاں ایک جمہوری حکومت قائم ہو۔ اس پر سہروردی مرحوم اور دوسرے لوگوں نے بڑا زور دیا۔ لیکن ہم نے اس فیصلہ پر عملدر آمد نہ ہونے دیا۔ ہم نے پھر فیلڈ مارشل ایوب خان کو جو حکمران تھے، یہ بات سمجھائی اور لوگوں کو اپنی جگہ بیٹھا کر سمجھایا کہ معاملے کے اس پہلو پر بھی غور کریں اور یہ دیکھیں کہ کہیں یہ تحریک ہی ساری ختم نہ ہو جائے۔ اس طرح انہوں نے اس پر عمل در آمد روک دیا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد سردار ابراہیم خان صاحب اور ہمارے درمیان مفاہمت کے پیچھے ایک اور جذبہ کارفرما تھا جس کا ذکر میں پھر کسی دوسری جگہ کروں گا۔ بہرحال میں ۱۹۵۶ء میں صدر بن گیا تو اتفاق کی بات یہ ہے کہ جس دن میں نے صدارت کا حلف لیا، اس دن چوہدری محمد علی وزارت عظمیٰ سے مستعفی ہو گئے اور حسین شہید سہروردی پرائم منسٹر بن گئے۔ سہروردی جس وقت پرائم منسٹر بنے ایک تو انہوں نے اس منصوبے سے اتفاق نہیں کیا جس منصوبے کی بنیاد پر ہم نے مسلم کانفرنس کو اکٹھا کیا تھا اور میں صدر بنا تھا اور دوسرا یہ کہ میرے اور ان کے درمیان کوئی اتفاق رائے اور موافقت پیدا نہ ہو سکی بلکہ ان کی سردار ابراہیم خان صاحب اور ان کے لوگوں کے ساتھ زیادہ موافقت تھی۔ وہ میری بہت عزت کرتے تھے لیکن طبیعت میں ان سے متعلق جو بعض تلخی کی باتیں تھیں، ان کے پیش نظر شاید وہ بات بن نہیں سکی۔ اس طرح یوں وہ پہلے دن ہی سے جماعت کے صدر بنے اور میں حکومت کا صدر بنا۔ اس طرح میری حکومت کو ہٹانے کے لئے سازشیں شروع ہو گئیں۔ پتہ نہیں آخری بار کس تاریخ کو میری حکومت برطرف کی گئی اور دوسری حکومت بنائی گئی۔ ہماری سیاست کا یہ بھی ایک ایسا پہلو ہے جس پر کافی کچھ بتانے کی ضرورت ہے۔ بہرحال اس طرح میری حکومت ہٹا دی گئی۔ تو یہ کہنا کہ سہروردی مرحوم کراچی کانفرنس کے فیصلوں میں شریک تھے اور قائد جمہوریت بھی کہلائے، غلط نہیں ہے۔ لیکن یہ جو میری حکومت بنی تھی، اس کا کراچی کے فیصلوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ دوسرا معاملہ تھا جس وجہ سے یہ حکومت معرض وجود میں آئی تھی۔ یہ کوئی جمہوری حکومت نہیں تھی نہ کسی جمہوری طریقے سے معرض وجود میں آئی تھی یعنی انتخاب کے طریقے سے نہیں آئی تھی بلکہ طریقہ وہی تھا کہ مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل کی ورکنگ کمیٹی نے مجھے نامزد کیا۔ آئین انہوں نے یہ بنا دیا تھا کہ مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل حکومت بنائے گی صدر حکومت جنرل کونسل کے سامنے جوابدہ ہو گا اور وہی اس کو منصب صدارت سے ہٹائے گی۔ تب پہلی مرتبہ ہمارا باقاعدہ لکھا پڑھا آئینی مسودہ تیار کیا گیا تھا۔ سہروردی صاحب کے ساتھ میرا اس بات پر بھی اتفاق ہو گیا تھا۔ لیکن جب میں صدر آزاد کشمیر بن گیا اور وہ پاکستان کے پرائم منسٹر ہو گئے تو انہوں نے وزارت امور کشمیر کے ذریعے مجھے پیغام بھیجا کہ تم یہ حکومت ابھی نہ بناؤ، نہ کابینہ بناؤ بلکہ اس کابینہ میں ہمارے آدمی بھی شریک کر لو۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنے کچھ آدمی بھی پیدا کر لئے تھے۔ مجھے وزارت امور



چوہدری محمد علی

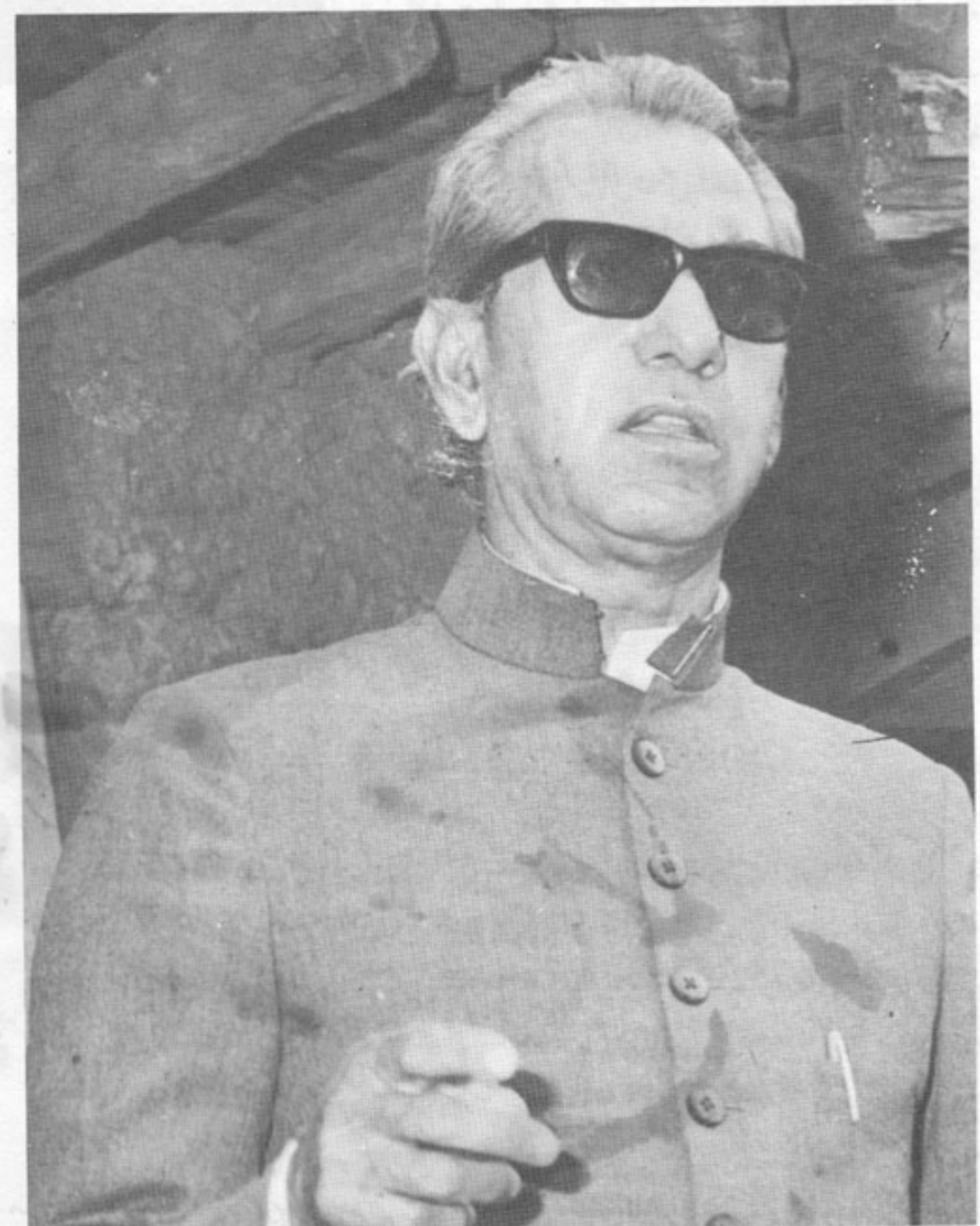
کشمیر کے سیکرٹری نے کہا کہ سہروردی صاحب کا یہ پیغام ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ سہروردی صاحب سے کہئے کہ یہ خالصتاً میرا حق ہے کہ میں کس قسم کی کابینہ بناؤں۔ جس میں سہروردی صاحب کا یا کسی اور کا کوئی دخل نہیں ہے۔ انہیں کہئے کہ وہ براہِ مہربانی اس معاملے میں دخل نہ دیں۔ چنانچہ میں نے کابینہ بنالی۔ اس سے بھی سہروردی صاحب کے ساتھ تلخیوں کا آغاز ہوا۔ مگر بدقسمتی سے حالات ایسے تھے کہ اسی دور میں قائد ملت چوہدری غلام عباس مرحوم کے ساتھ بھی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ یہ بھی ہماری کشمیری سیاست کا ایک خاص پہلو ہے جس کا ذکر کسی ایک موقع پر مناسب ہو گا۔ کیونکہ اس کے دو تین حصے ہیں۔ ایک تو یہ کہ خود کشمیر کانفرنس کی تجویز کیا تھی۔ اس میں کیا فیصلہ کیا گیا اور اس فیصلے پر عمل در آمد کیوں نہیں ہوا؟ اس فیصلے کے علاوہ حکومت کس طرح بنی۔ حکومت میں ہمارا سردار ابراہیم خان صاحب سے سمجھوتہ کیسے ہوا، پھر اس کے بعد سہروردی صاحب سے میری کیسے موافقت نہ ہو سکی۔ اس کا کیا سبب تھا، اور اسی طرح رئیس الاحرار قائد ملت چوہدری غلام عباس مرحوم کے ساتھ ان ہی دنوں میری موافقت کیوں نہ ہو سکی اور پھر اس کے نتیجے میں حکومت کو کس طریقہ کار سے تبدیل کیا گیا۔ میں نے اس طریقہ کار میں کیا کردار ادا کیا۔ اصل میں یہ وہ سوالات ہیں جو اس ایک سوال کے اندر مضمر ہیں اور ان میں ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ دیکھنا پڑے گا۔

وزیراعظم سہروردی کی مداخلت

سہروردی مرحوم کے لئے مداخلت کرنے کا کوئی آئینی، قانونی، جمہوری جواز تو تھا نہیں، مگر میرا خیال ہے کہ آج تک جو رسم چلی آ رہی ہے وہ یہی ہے۔ سہروری مرحوم نے چوہدری صاحب مرحوم اور مجھے ایک سوال کے جواب میں بڑے غصے سے کہا تھا کہ میں کشمیر کے لئے پاکستان کو داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ غالباً ان کا خیال یہی ہو گا کہ آزاد کشمیر میں کوئی ایسی حکومت نہ بنے جو کشمیر کی آزادی کے لئے اپنے طور پر کوئی کام کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ یہ بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے جس وجہ سے انہوں نے مداخلت کی اور میری حکومت کو ہٹایا۔

قبائلی رضا کار

مہاراجہ نے قبائلی رضا کاروں کی مداخلت کے باعث بھارت سے مدد طلب کی تھی صحیح نہیں، کیونکہ پنڈت جواہر لال نہرو، لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ کلف کے درمیان پہلے سے یہ طے تھا کہ پٹھان کوٹ کا علاقہ ریڈ کلف ایوارڈ کے ذریعے بھارت کو دیا جائے تاکہ اسے کشمیر میں داخلے کیلئے فوجی راستہ مہیا ہو جائے۔ تو یہ اسوقت سے



سردار محمد ابراہیم

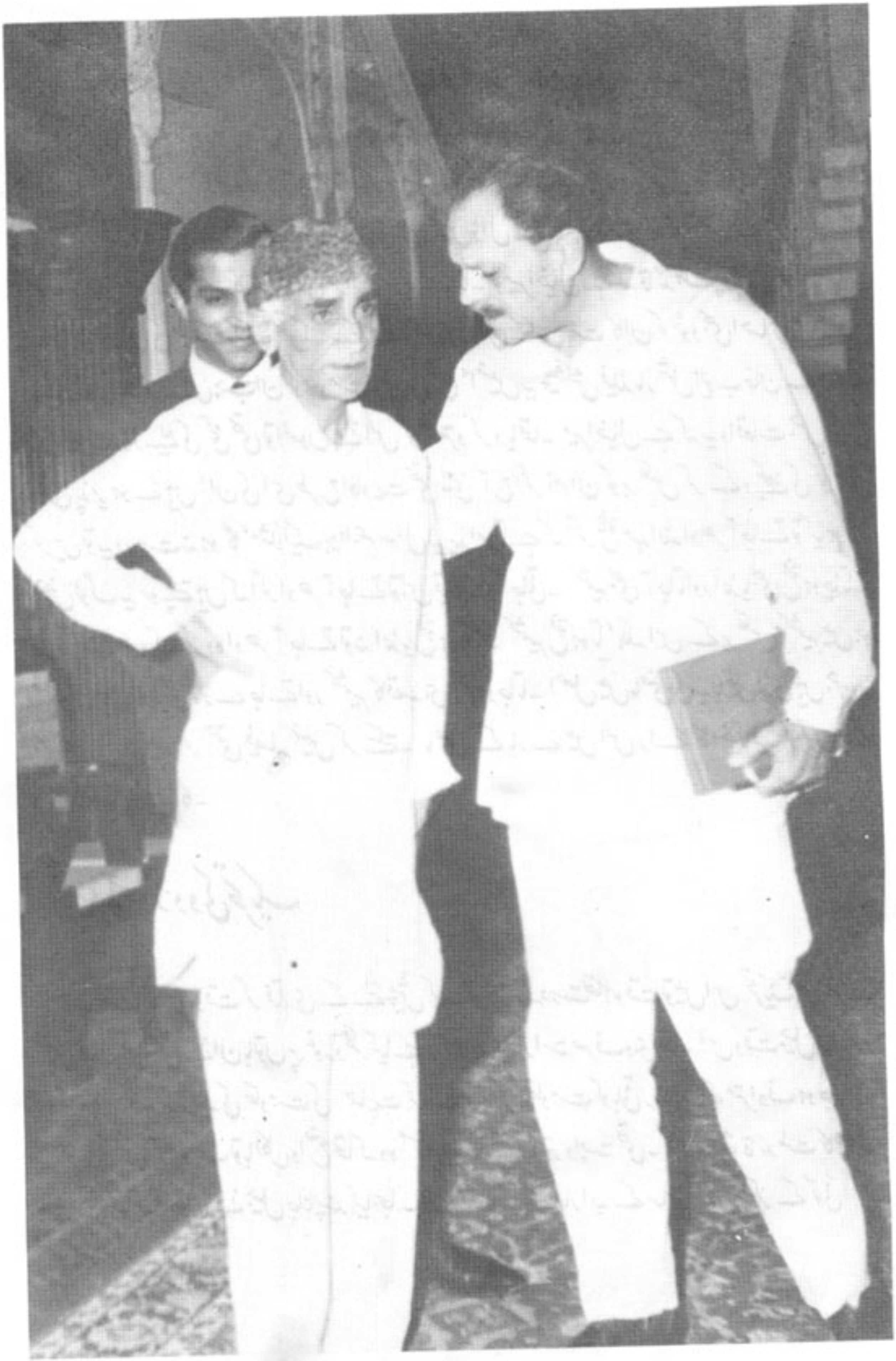
سازش تیار تھی اور اگر قبائلی کشمیر میں داخل نہ بھی ہوتے تب بھی اور پھر ہندوستان قبائلیوں کے ذکر کو جان بوجھ کر ہوا دیتا ہے۔ قبائلی تو بعد میں گئے ہیں۔ یہ سب سے پہلے تحریک ہم نے چلائی ہے۔ لگاتار پندرہ مہینے تو ہم لڑتے رہے ہیں۔ ہمارا ذکر بھارت کی حکومت جان بوجھ کر نہیں کرتی کیونکہ دنیا کے سامنے پھر جھوٹے ہوتے ہیں کہ ریاست کے لوگ خود مہاراجہ کی حکومت نہیں چاہتے بلکہ پاکستان کے ساتھ ملنا چاہتے تھے اور ہماری طرف سے بدقسمتی سے اس کا کوئی جواب نہیں دیا جاتا۔ قبائلی تو ہماری مدد کے لئے آئے اور قبائلیوں کو بھیجا کسی نے نہیں بلکہ وہ تو خود اپنی مرضی سے آئے۔ تو اگر قبائلی نہ بھی آئے ہوتے تب بھی پوزیشن یہی ہوتی کہ ہندوستان کے ساتھ مہاراجہ نے الحاق کرنا تھا۔ یہ انہوں نے محض بہانہ بنایا اور یہ صحیح نہیں ہے کہ قبائلی آئے تو ایسا ہوا۔

حملہ براستہ جمّوں

اصل میں یہ آج بیٹھ کر سوچنے کی باتیں ہیں کہ نپولین دس منٹ پہلے پہاڑی پر چڑھ گیا ہوتا تو یقیناً دنیا کی تاریخ مختلف ہوتی، مگر آیا وہ چڑھ سکتا تھا یا نہیں؟ یہ بعد میں بیٹھ کر سوچنے والی باتیں ہیں۔ اس وقت جو کچھ ہم نے کیا، ابھی تک کوئی ملٹری سائنس والے نہیں بتا سکے کہ اس سے زیادہ بہتر کوئی بات ہو سکتی تھی۔ ان حالات میں یہی صورت ممکن تھی۔

رئیس الاحرار کی آمد

موجودہ حالات میں اگر آج ہم ماضی کے اس قسم کے واقعات پر فیصلے کریں گے تو وہ صحیح نہیں ہوں گے۔ اس لئے کہ یہ سوال رئیس الاحرار سے پوچھا جانا چاہئے تھا۔ اس کی صحیح توجیہ وہی کر سکتے تھے اور بتا سکتے تھے کہ وہ کیا بات تھی کہ وہ مری میں بیٹھے رہے اور حکومت کے سربراہ نہیں بنے لیکن چوہدری غلام عباس کے یہاں آتے ہی بدقسمتی سے ان کے خلاف سازشیں شروع ہو گئیں تھیں۔ خاص طور پر جب سیز فائر ہوا۔ اس معاملے میں حکومت پاکستان کے ساتھ قائد ملت کا اختلاف رائے تھا۔ اس لئے حکومت نے غالباً یہی سمجھا کہ چوہدری صاحب کی جو طاقت ہے، اس کو کم کیا جائے۔ دوسری طرف چوہدری صاحب اصل میں اس تحریک کے سربراہ رہنا چاہتے تھے۔ وہ حکومت کی سربراہی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اب یہ دونوں طرف دلائل دیئے جا سکتے ہیں کہ چوہدری صاحب اگر خود حکومت کے سربراہ ہوتے تو کیا صورتحال ہوتی۔ میرا خیال یہ ہے کہ چوہدری صاحب حکومت کے سربراہ ہوتے تو حکومت پاکستان اس بات کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس وقت سب لوگ یہی چاہتے تھے کہ جنگ بند ہو اور بھارت کے ساتھ صلح صفائی سے سیاسی ذرائع سے معاملات طے ہوں اور چوہدری صاحب اگر تحریک کے سربراہ ہوتے تو یہ نہیں ہو سکتا تھا۔



صدر محمد ایوب اور چوہدری غلام عباس

اس لئے حکومت کی اس خواہش کا چوہدری صاحب کو علم ہو گا اور چوہدری صاحب حکومت پاکستان کو کسی مشکل میں یا کسی غلط پوزیشن میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ وہ جب بھی کشمیر کی بات کرتے تھے تو پہلے پاکستان کی سلامتی، بقا اور استحکام کو دیکھتے تھے اور پھر کشمیر کی بات کرتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ کشمیر کا معاملہ مؤخر ہو سکتا ہے لیکن پاکستان کو ہم کسی پریشانی میں نہیں ڈال سکتے۔ اگر ڈالیں گے تو اس سے زیادہ نقصان ہو گا اور پھر اس سے کشمیر کا معاملہ بھی خراب ہو جائے گا۔ تو میرا خیال ہے کہ قائد ملت چوہدری غلام عباس کا مزاج اور ان کی طبیعت ایک تحریک کے لئے تو سود مند تھی۔ اس بات کا ان کو خود بھی احساس تھا۔ اسی لئے انہوں نے بعد میں جب ان کو حکومت پیش کی گئی، انہیں یہ پیشکش فیلڈ مارشل ایوب خان کے زمانے میں میرے ذریعے کی گئی تھی تو انہوں نے اس کو مسترد کر دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ واقعات جس طرح وقوع پذیر ہوئے ہیں، ان کی اسی طرح افادیت تھی یعنی آج اگر ہم ان کو برعکس کر کے دیکھنے کی کوشش کریں تو یہ درست نہ ہو گا، مثلاً ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر شیخ عبداللہ ادھر آ جاتے تو کیا ہوتا؟ بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اگر ادھر آ جاتے تو بس قیامت آ جاتی۔ کشمیر بھی آ جاتا اور انڈیا بھی فتح ہو جاتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ ادھر آ جاتے تو نہ انڈیا فتح ہوتا، نہ کشمیر فتح ہوتا، بلکہ اس کے برعکس کشمیر میں جو مسلمان ہیں، وہ بھی مارے جاتے اور کشمیر کا قصہ ہی ختم ہو جاتا۔ اصل میں ماضی کی یہ باتیں ایسی ہیں جن پر ہم اس وقت بیٹھ کر حتمی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ ماضی کے بارے میں اس رائے کا اختلاف لوگوں کے درمیان باقی رہے گا۔

کشمیر چھوڑ دو کی تحریک

قائد ملّت کا اس وقت گرفتاری کے لئے پیش کرنے کا فیصلہ درست تھا۔ اس وقت تو میں اس تحریک میں شریک نہیں تھا، لیکن میں نے ان باتوں پر غور و فکر کیا ہے۔ اس وقت راستہ صرف وہی تھا۔ اس وقت جیل سے باہر رہ کر کام کرنا مہاراجہ کی حکومت کی حمایت کرنے اور اس حکومت کو باقی رکھنے کے مترادف ہو جاتا اور مسلم کانفرنس کا موقف تو بالکل واضح تھا کہ وہ مسلم لیگ کے ساتھ وابستہ تھی۔ اس لئے قائد ملت کا فیصلہ بالکل صحیح تھا کہ انہوں نے جیل جانا پسند کیا بجائے اس کے کہ وہ مہاراجہ کے ساتھ ساز باز کر کے کوئی اس قسم کا کام کرتے۔

مسئلہ کشمیر کیا ہے۔ اگر اسے "مقدمہ کشمیر" کا نام دیا جائے تو اس کا تاریخی اور تفصیلی جائزہ اس طرح پیش کیا جاسکتا ہے۔

کشمیر میں اسلام اور مسلمان دور حکومت کا آغاز

۱۳۱۹ء میں ایک چنگیزی سردار ذوالقدر خان نے کشمیر پر حملہ کیا۔ راجہ سہدیو (۱۳۰۰ء۔ ۱۳۱۹ء) افراتفری کے عالم میں ملک چھوڑ کر کہیں بھاگ گیا۔ اس موقع سے راجہ کے ایک ملازم رینچن، نے فائدہ اٹھایا اور کشمیر پر اپنی حکومت قائم کرلی۔ وہ لداخی بدھ تھا۔ حکومت سنبھالنے کے کچھ عرصہ بعد اس نے ایک مسلمان درویش سید شرف الدین بلبل شاہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا اور سلطان صدرالدین (۱۳۲۰ء۔ ۱۳۲۳ء) کے نام سے حکومت کی۔ وہ کشمیر کا پہلا مسلمان بادشاہ تھا۔

شاہ میری خاندان

۱۳۳۹ء میں شاہ میر سلطان شمس الدین کا لقب اختیار کر کے تخت نشین ہو گیا۔ اور اس نے سلطنت شاہ میری کی بنیاد ڈالی۔ وہ سوات کا رہنے والا تھا اور راجہ سہدیو کے عہد سے مسلسل ایک سرکاری اہلکار کی حیثیت سے کشمیر میں رہ رہا تھا۔ سلطان شمس الدین (۱۳۳۹ء۔ ۱۳۴۲ء) کے برسر اقتدار آنے سے کشمیر میں اسلام کی ضیاء پاشیوں کے بابرکت دور کی ابتداء ہوئی۔ سلطان شہاب الدین شاہ میری (۱۳۴۵ء۔ ۱۳۷۳ء) کے عہد حکومت میں ایران کے مشہور صوفی بزرگ حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی تبلیغ اسلام کی غرض سے کشمیر تشریف لائے۔ آپ کی آمد کے ساتھ ہی کشمیر میں ہندومت اور اسلام میں کشمکش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ برہمنوں نے اسلامی تعلیمات کے خلاف زبردست محاذ قائم کیا لیکن ان کی ساری مخالفت اکارت گئی۔ اسلامی طریقے اور اخلاقی قدریں کشمیری تمدن کے جسم میں روح کی طرح پیوست ہو گئیں۔ یوں کشمیر میں ایک عظیم الشان مذہبی و تمدنی انقلاب کی بنیاد پڑی۔ جس کی تکمیل شاہ ہمدان کے فرزند سید میر محمد ہمدانی کے ہاتھوں ہوئی۔

سلطان زین العابدین بڈشاہ

۱۴۲۰ء سے ۱۴۷۰ء تک سلطان زین العابدین بڈشاہ نے کشمیر پر حکومت کی۔ اس کا عہد کشمیر کی تاریخ کا سنہری زمانہ ہے لیکن سلطان کے جانشینوں کی نااہلی سے شاہ میری خاندان کو زوال آگیا۔ چنانچہ

۱۵۴۱ء میں ہمایوں کے جرنیل مرزا حیدر دوغلات نے کشمیر پر قبضہ کر لیا اور دس سال حکومت کی۔ مرزا حیدر چکوں کے خلاف ایک جنگ میں ہلاک ہوا۔

چک، مغل اور افغان دورِ حکومت

کشمیر میں چکوں کا جدِ امجد لنگر چک گلگت سے آ کر راجہ سہدیو کے پاس ملازم ہوا تھا۔ اس کی اولاد شاہ میری عہد میں بڑے بڑے عہدوں پر پہنچی۔ انہی لوگوں کی سازشوں سے اس خاندان کو تخت سے محروم ہونا پڑا۔ ۱۵۵۵ء میں چک برسرِ اقتدار آئے اور انہوں نے ۳۱ برس حکومت کی۔ وہ مذہباً شیعہ تھے اور ان کے مذہبی تعصب نے وادی میں شیعہ سنی مخاصمت کی صورت پیدا کر لی تھی۔ بالآخر کشمیریوں کا ایک وفد کشمیر کے عالم دین اور روحانی بزرگ حضرت شیخ یعقوب صرفی اور شیخ حمزہ کی قیادت میں مغل بادشاہ اکبر اعظم کے پاس پہنچا اور اسے کشمیر کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ ۱۵۸۶ء میں مغل فوج کشمیر میں داخل ہوئی۔ مغلیہ دور (۱۵۸۶ء۔ ۱۷۵۲ء) میں کشمیر کو ایک صوبے کی حیثیت دی گئی۔ مغل شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت بتدریج زوال پذیر ہوتی گئی اور کشمیر بھی خانہ جنگی کی لعنت میں گرفتار ہو گیا۔ چنانچہ میر مقیم نے جو اس زمانے کا ایک نامور سردار تھا کابل پہنچ کر احمد شاہ ابدالی سے رابطہ قائم کیا اور اسے کشمیر پر حملہ کرانے کی دعوت دی۔ چنانچہ ابدالی فوج نے ۱۷۵۲ء میں کشمیر کو سلطنت کابل میں شامل کر لیا۔

سکھ راج

کشمیر میں افغانیوں کی عملداری ۶۷ برس تک قائم رہی۔ ۱۸۱۹ء میں پنجاب کے سکھ حکمران رنجیت سنگھ نے کشمیر پر قبضہ کر لیا۔ اسے کشمیر پر حملہ کرنے کی ترغیب ایک کشمیری پنڈت بیربل درنے دی تھی۔ کشمیر پر سکھوں کا قبضہ یہاں کے مسلمانوں کیلئے ایک سانحہ عظیم تھا۔ اس سیاسی تبدیلی سے ان کی غلامی اور بد نصیبی کے ایک اور دور کا آغاز ہوا۔

بیع نامہ امرتسر

ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط قائم ہونے کے بعد انگریزوں نے کشمیر کو اپنی فوج کے ایک ڈوگرہ افسر مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ ۷۵ لاکھ روپے کے عوض فروخت کر دیا اور اس طرح وہ رسوائے زمانہ بیع نامہ

امرتسر وجود میں آیا جس کے متعلق حکیم امت نے فرمایا تھا کہ۔

"قومے فروختند چہ ارزاں فروختند۔"

اس بیع نامہ کا متن درج ذیل ہے۔

دفعہ نمبر ۱

برطانوی حکومت تمام پہاڑی علاقہ مع اس کے ملحقات کے جو دریائے سندھ کے مشرق اور دریائے راوی کے مغرب میں واقع ہیں، بشمول چمبہ بغیر لاہول، جو کہ ۹۔ مارچ ۱۸۴۶ء کے صلح نامہ لاہور کی دفعہ ۶ کی رو سے لاہور کی ریاست نے برطانوی حکومت کے حوالے کئے ہیں، مہاراجہ گلاب سنگھ اور ان کی اولاد نرینہ کے آزاد قبضے میں ہمیشہ کیلئے تبدیل کرتی ہے۔

دفعہ نمبر ۲

خطہ زمین کی مشرقی سرحد، جو کہ مندرجہ بالا دفعہ کے تحت مہاراجہ گلاب سنگھ کے نام منتقل کی گئی ہے، اس مقصد کیلئے برطانوی حکومت اور مہاراجہ گلاب سنگھ کی طرف سے مقرر کئے جانے والے کمشنر طے کریں گے اور سروے کے بعد ایک الگ انتظام کے تحت اس کا تعین کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر ۳

مہاراجہ گلاب سنگھ اور ان کے وارثوں کے نام مندرجہ بالا دفعات کی رو سے جو انتقال کیا گیا ہے، اس کے معاوضے میں مہاراجہ گلاب سنگھ برطانوی حکومت کو ۷۵ لاکھ روپے (نانک شاہی) ادا کرے گا۔ ۵۰ لاکھ روپے اس صلح نامہ کے شروع ہوتے وقت اور ۲۵ لاکھ روپے یکم اکتوبر ۱۸۴۶ء کو یا اس سے قبل۔

دفعہ نمبر ۴

مہاراجہ گلاب سنگھ کے ان علاقوں کی سرحدیں کسی بھی وقت برطانوی حکومت کی مرضی کے بغیر تبدیل نہیں ہو سکیں گی۔

دفعہ نمبر ۵

اگر مہاراجہ گلاب سنگھ اور ریاست لاہور یا کسی اور پڑوسی ریاست کے درمیان کوئی متنازعہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہو' تو اسے طے کرنے کیلئے انہیں حکومت برطانیہ کو ثالث مقرر کرنا ہو گااور برطانوی حکومت کافیصلہ ان کیلئے قابل قبول ہو گا۔

دفعہ نمبر ۶

مہاراجہ گلاب سنگھ اور ان کے ورثاء اپنی تمام قوت کے ساتھ برطانوی سپاہیوں کے ساتھ شامل ہو جائیں گے جب وہ پہاڑوں پر یا ان کے مقبوضہ علاقوں کے پڑوس میں مصروف ہوں گے۔

دفعہ نمبر ۹

برطانوی حکومت مہاراجہ گلاب سنگھ کو بیرونی حملہ آوروں سے بچانے میں اس کی مدد کرے گی۔

دفعہ نمبر ۱۰

مہاراجہ گلاب سنگھ برطانوی حکومت کی اطاعت قبول کرتے ہیں اور اس اطاعت کی نشانی کے طور پر برطانوی حکومت کو ہر سال ایک گھوڑا' ۱۲ بکریاں اعلیٰ نسل (چھ بکریاں اور چھ بکرے) اور تین جوڑے کشمیری شالوں کے پیش کریں گے۔

یہ صلح نامہ جس میں مندرجہ بالا دفعات شامل ہیں' آج کے روز فریڈرک کیوری اور برنیٹ میجر ہنری منٹگمری لارنس کے ذریعے رائٹ آنریبل سرہنری ہارڈنگس جی۔ سی۔ بی گورنر جنرل کے حکم سے برطانوی حکومت اور بہ نفس نفیس مہاراجہ گلاب سنگھ کے درمیان طے ہوااور آج کے روز رائٹ آنریبل سرہنری ہارڈنگس جی۔ سی۔ بی گورنر جنرل کی مہر ثبت ہو کر منظور ہوا۔

امرتسر میں آج ماہ مارچ کے ۱۶ویں دن ۱۸۴۶ عیسوی
بمطابق ربیع الاول کے ۷ اویں دن ۱۲۶۲ ہجری کو لکھا گیا۔

ڈوگرہ دورِ حکومت اور آزادی کی جدوجہد

۱۸۴۶ء کے عہد نامہ امرتسر کی رو سے کشمیر گلاب سنگھ کے ہاتھ چلا گیا۔ برسوں کی غلامی کے بعد ۱۹۳۱ء میں کشمیریوں نے انگڑائی لی ۔ ان کے صبر کا جام جو مدت سے لبریز چلا آتا تھا' بندش خطبہ اور توہینِ قرآن کے واقعات سے چھلک پڑا اور یہ واقعات ریاست میں بنیادی حقوق کے حصول کی جدوجہد کا نقطہ آغاز بن گیا۔ ریاست بھر میں پامالی حقوق کے خلاف عوامی تحریک کو اکتوبر ۱۹۳۲ء میں آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی صورت میں منظم کیا گیا۔

مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس

۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۸ء کے کشمیر اسمبلی کے انتخابات میں اگرچہ حکومت نے انتہائی با اثر افراد کو مسلم کانفرنس کے سامنے صف آراء کرنے کی کوشش کی لیکن عوامی سیلاب ان سب کو بہا کر لے گیا۔

۱۹۳۸ء کے انتخابی نتائج نے کشمیر کے ہندو وزیر اعظم آئینگر کے اوسان خطا کر دیئے تھے۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کو ہمہ گیر تنظیم اور ان کے شاندار اتحاد کو پاش پاش کرنے کی ٹھانی اور شیخ محمد عبداللہ کو ہم خیال بنا کر مسلم کانفرنس کی جگہ جون ۱۹۳۹ء میں نیشنل کانفرنس بنوا ڈالی ۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے جب برطانوی ہند کے مسلمانوں نے پاکستان کے نصب العین کو اپنایا تو ریاستی مسلمانوں کے تخیل کو پاکستان کے تصور نے فوراً مسحور کر لیا۔ چنانچہ مطالبہ تقسیم ہند کے کوئی چھ ماہ بعد مسلم کانفرنس کا دوبارہ احیاء کیا گیا اور جہاں تک نظریۂ پاکستان کا تعلق ہے ،مسلم کانفرنس ریاست میں مسلم لیگ کا دوسرا نام تھا۔ مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کی نظریاتی رقابت نے ریاست میں اس کشمکش کی صورت اختیار کر لی جو برطانوی ہند میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان بپا تھی۔ برصغیر کی ۵۶۲ دیسی ریاستوں میں کشمیر واحد ایسی ریاست تھی جہاں متحدہ قومیت اور نظریۂ پاکستان میں اسی شدت سے جنگ لڑی گئی جس شدت سے برطانوی ہند میں لڑی گئی تھی۔ نیشنل کانفرنس کی پشت پر ڈوگرہ حکومت کا دبدبہ' کانگریس کا سرمایہ اور پروپیگنڈا تھا جس کا مسلم کانفرنس نے بڑی پامردی اور ثابت قدمی سے مقابلہ کیا۔

قائداعظمؒ کادورۂ کشمیر

وسط ۱۹۴۴ء میں قائداعظمؒ محمد علی جناح کا دورہ کشمیر ریاست میں نظریہ پاکستان کیلئے زبردست تقویت کا باعث ہوا جس سے نیشنل کانفرنس اور ڈوگرہ حکمران دونوں پریشان تھے۔ قائداعظمؒ کے سری نگر میں قیام کے دوران ایک اعلیٰ ہندوافسر سرگنگاناتھ نے ایک سرکاری کمیشن کے ایک رکن آغا شیر علی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "To talk of Pakistan in Kashmir is sedition"

ہندوستان کی آزادی کے مختلف منصوبے

کشمیر میں متحدہ قومیت اور دوقومی نظریہ میں کشمکش جاری تھی کہ ۱۹فروری ۱۹۴۶ء کو برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ ایک خاص مشن ہندوستان بھیجا جائے گا جو سیاسی پارٹیوں کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے ہندوستان کے آئینی مستقبل کا حل تلاش کرے گا۔ کیبنٹ مشن نے ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کے راہنماؤں، دیسی ریاستوں کے حکمرانوں اور صدر حکومت ہند کے اعلیٰ حکام سے بات چیت کے بعد سفارشات مرتب کیں۔ مشن نے ۱۶مئی ۱۹۴۶ء کو ایک بیان میں سفارش کی کہ۔

> "برطانوی ہند اور ریاستوں، دونوں پر مشتمل ایک ہندوستانی وفاق ہونا چاہیے جس کے ماتحت امور خارجہ، دفاع اور مواصلات ہوں"۔

ریاستوں اور برطانوی ہند کے مابین آئندہ تعلقات کے بارے میں کہا گیا کہ

> "اقتدار اعلیٰ نہ تو تاج برطانیہ اپنے پاس رکھ سکتا ہے اور نہ ہی نئی حکومت کو منتقل کیا جاسکتا ہے"۔

ہندوستانی وفاق میں ریاستوں کی شمولیت

۲۹جنوری ۱۹۴۷ء کو بمبئی میں ایوان والیان ریاست کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس کا حاصل یہ تھا کہ ہندوستانی وفاق میں ریاستوں کی شمولیت باہمی بات چیت کی بنیاد پر ہونی چاہئے۔ آخری فیصلہ ہر ریاست کی مرضی پر منحصر ہو اور ایسا فیصلہ نئے دستور کی جانچ پڑتال کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ ریاستیں جو اختیارات یونین کو اپنی مرضی سے تفویض کریں گی، ان کے سوا سارے اختیارات پر ان کی اپنی دسترس ہوگی۔ آئین ساز اسمبلی ریاستوں کے اندرونی معاملات اور دستور حکومت میں مداخلت

کی مجاز نہ ہوگی۔ کسی ریاست کی علاقائی سالمیت میں کوئی تبدیلی آئی تو وہ آزادانہ رضامندی کے بغیر عمل میں نہیں آئے گی۔

انتقال حکومت کا اعلان

۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو برطانوی وزیراعظم مسٹر اٹیلی نے دارالعوام میں ڈرامائی طور پر اعلان کیا کہ کابینہ مشن پلان کے مطابق جون ۱۹۴۸ء تک برطانوی حکومت ہندوستان میں اقتدار حکومت خود ہندوستانیوں کو سونپ دینا چاہتی ہے۔ اعلان میں ریاستوں کے بارے میں اس موقف کا اعادہ کیا گیا کہ اقتدار اعلیٰ برطانوی ہند کی کسی بھی حکومت کو نہیں سونپا جائے گا بلکہ اس کے اختتام پر ریاستیں خود مختار ہو جائیں گی۔

ریاستوں کے الحاق کا مسئلہ

کانگریسی لیڈر اس خیال سے از حد فکرمند تھے کہ خود مختار ریاستیں ہندوستان کے اتحاد میں بہت بڑی رکاوٹ بن جائیں گی اور وہ زیادہ سے زیادہ ریاستوں کو آئین ساز اسمبلی میں لانے کے آرزومند تھے۔ ۱۸ اپریل ۱۹۴۷ء کو گوالیار میں آل انڈیا اسٹیٹس پیپلز کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے پنڈت نہرو نے ریاستوں کو یہ دھمکی دی کہ جو ریاست دستور ساز اسمبلی میں شامل نہیں ہوگی، اسے ملک دشمن عناصر تصور کیا جائے گا اور ایسی ریاست کو اس سلوک کے نتائج برداشت کرنے کیلئے تیار رہنا پڑے گا۔ مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری خان لیاقت علی خان نے پنڈت نہرو کے اس بیان کو سراسر ناعاقبت اندیشانہ قرار دیا اور ریاستوں سے کہا کہ جب برطانوی ہندوستان کے بارے میں کسی فیصلہ کا اعلان ہو جائے گا تو ریاستیں پاکستان یا ہندوستان سے معاملہ کرنے یا اپنے لئے کامل طور پر آزاد اور با اختیار ہوں گی۔ لیکن پنڈت نہرو کی دھمکی کی تاب نہ لا کر متعدد ریاستی حکمرانوں نے دستور ساز اسمبلی میں شرکت کا اعلان کر دیا۔

کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی تجویز

اس پس منظر میں کشمیر کے مسلم کانفرنسی حلقوں کو یہ تشویش لاحق ہوئی کہ مبادا ریاست کا ہندو حکمران کانگریس کی خواہش کے مطابق دستور ساز اسمبلی میں شرکت کا اعلان کر دے۔ چنانچہ چودھری حمید اللہ خان نے مہاراجہ کو مشورہ دیا کہ ریاست کے آزاد و خود مختار ہونے کا فوری اعلان کریں نیز ایک دستور ساز اسمبلی قائم کریں تاکہ ریاستی رعایا اپنی خواہشات کے مطابق اپنا دستور تیار کرے۔ اس پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلہ میں چودھری صاحب نے مہاراجہ کو مسلمانوں کی طرف سے مکمل حمایت اور

تعاون کا یقین بھی دلایا۔ ان ایام میں دربار کشمیر اور کانگریس کے تعلقات از حد کشیدہ تھے۔ چودھری حمیداللہ خان کے بیان نے کانگریسی لیڈروں کو چونکا دیا۔ ان دنوں مہاراجہ اور نیشنل کانفرنس ایک دوسرے کے حریف تھے۔ چنانچہ کانگریس نے مہاراجہ اور نیشنل کانفرنس کے درمیان مفاہمت کرانے کیلئے جماعتی صدر اچاریہ کرپلانی کو ۱۷ مئی کو سرینگر بھیجا لیکن انہیں اپنے مشن میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

شیخ عبداللہ کا موقف

۳۰ مئی کو جموں میں چودھری حمیداللہ نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ آزاد و خودمختار کشمیر پاکستان اور ہندوستان دونوں سے دوستانہ تعلقات رکھے گا لیکن وہ ان میں سے کسی کا طفیلی بن کر نہیں رہے گا۔ چودھری حمیداللہ کے بیانات کے بارے میں شیخ عبداللہ کا ردعمل ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے جو انہوں نے بھدرواہ جیل سے جموں میں اپنے ایک دوست کے نام لکھا جس کا ذکر جون ۱۹۴۷ء کو دہلی کے مشہور کانگریسی اخبار ہندوستان ٹائمز نے بھی کیا تھا۔ اس خط میں انہوں نے مہاراجہ کو مشورہ دیا کہ انہیں مسلم کانفرنس کے لیڈروں کے اس بیان سے کہ کشمیر ایک آزاد ریاست کے طور پر بھی قائم رہ سکتی ہے، دھوکہ نہ کھانا چاہئے بلکہ اس کا الحاق فوری طور پر ہندوستان سے کر دینا چاہئے۔

ریاستوں کے حقوق کی بازیافت

۳ جون کے منصوبہ تقسیم میں ریاستوں کے متعلق وہی اصول قائم رکھا گیا تھا جسے کابینہ نے اپنی ۱۲ مئی ۱۹۴۶ء کی یادداشت میں یوں بیان کیا تھا۔

> "ریاستیں اپنے جن حقوق سے اقتدار اعلیٰ کے حق میں دستبردار ہوئی تھیں، وہ سب کے سب ریاستوں کو واپس مل جائیں گے۔ اس طرح ایک طرف ریاستوں اور دوسری طرف تاج برطانیہ اور برطانوی حکومت کے مابین سیاسی سمجھوتہ ختم ہو جائے گا اور اس سے جو خلا پیدا ہو گا، ریاستوں کو اسے برطانوی ہند میں جانشین حکومت یا حکومتوں کے ساتھ وفاقی تعلقات کے ذریعے پر کرنا ہو گا۔ یا بصورت دیگر انہیں ایسی حکومت یا حکومتوں کے ساتھ سیاسی نوعیت کے سمجھوتے کرنا ہوں گے"۔

اس اصول کے مطابق قانون آزادیٔ ہند ۱۹۴۷ء میں حسب ذیل دفعہ شامل کی گئی تھی۔

"مقررہ دن (۱۵) اگست ۱۹۴۷ء سے ہز میجسٹی کی ریاست ہائے ہند

پر بالادستی ختم ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ تمام معاہدے اور اقرار نامے بھی جو قانون ہذا کی منظوری کے دن نافذ العمل تھے ' وہ تمام ذمہ داریاں جو اس دن تک ریاست ہائے ہند یا ان کے والیان کے سلسلہ میں ہز میجسٹی پر عائد ہوتی تھیں اور جملہ طاقتیں' حقوق ' اختیارات یا احاطے جنھیں ہز میجسٹی اس دن تک دیسی ریاستوں یا ان کے بابت برت سکتے تھے 'ختم ہو جاتے ہیں "۔

ریاستوں کے الحاق کے بارے میں اختلاف

۴ جون کو وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک پریس کانفرنس میں ریاستوں کے بارے میں اس موقف کا اعادہ کیا کہ انہیں کسی ایک آئین ساز اسمبلی میں شامل ہونے ' آزاد رہنے یا کوئی اور بندوبست کرنے کا حق ہو گا۔ وائسرائے نے ۱۳ جون کو کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کا ایک اجلاس طلب کیا۔ جس میں من جملہ اور باتوں کے یہ معاملہ بھی زیر بحث آیا کہ ریاستیں آزاد ہو سکیں گی؟ پنڈت نہرو کی رائے یہ تھی کہ ریاستوں کے پاس بین الاقوامی تعلقات قائم رکھنے اور جنگ کرنے کے وسائل کا فقدان ہے 'اس لئے وہ خود مختار مملکتوں کی حیثیت سے نہیں رہ سکتیں۔ انہیں کسی ایک حکومت میں ضرور شامل ہو جانا چاہئے۔ قائداعظمؒ نے کہا کہ اس باب میں ریاستیں بالکل آزاد و خود مختار ہیں کہ دونوں میں سے کسی ایک حکومت میں شامل ہو جائیں اور اگر یہ نہ چاہیں تو آزاد رہ سکتی ہیں لیکن یہ بات ریاستوں اور مستعمراتی حکومتوں ' دونوں کیلئے سود مند ہو گی کہ وہ ضرورت کے مطابق ایک دوسرے کے ساتھ سمجھوتے کر لیں۔ اس کے فوراً بعد ہی کانگریس اور مسلم لیگ کے نقطہ ہائے نظر میں یہ اختلاف کھل کر سامنے آ گیا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے جس کا اجلاس ۱۴ جون کو ہوا' یہ رائے ظاہر کی کہ اقتدار اعلیٰ کے ختم ہونے پر ریاستیں آزاد و خود مختار نہیں بن سکتیں کیونکہ وہ باقی ملک سے جدا نہیں رہ سکتیں 'اور سلطانیٔ جمہور کے اس دور میں عوام ہی اپنے مستقبل کا تعین کرنے کے مجاز ہوں گے۔ مسٹر گاندھی نے کہا " والیانِ ریاست کی طرف سے اعلانات آزادی ہندوستان کے کروڑوں باشندوں کے خلاف اعلان جنگ کے مترادف ہیں " ۔ اس کے برعکس ۱۷ جون کو دہلی میں قائداعظمؒ نے اعلان کیا کہ اقتدار اعلیٰ کے ختم ہو جانے سے ریاستیں اس امر میں مجاز ہوں گی کہ خواہ وہ کسی ایک دستور ساز اسمبلی میں شریک ہوں ' یا آزاد رہنا چاہیں تو وہ آزاد رہ سکتی ہیں۔

اگر ہندوستان اور پاکستان ریاستوں کے الحاق کے بارے میں تقسیم ہند کے اصول پر اتفاق کر لیتے تو اس سے آئندہ ان کے مابین نزاع کے مواقع گھٹ جاتے۔ لیکن اس معاملے میں کانگریس اور مسلم لیگ میں اختلاف اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ صلح وصفائی سے اس کا حل ہونا ناممکن ہو گیا تھا۔ ان کی پالیسی

اصل میں حیدر آباد اور کشمیر پر متصادم تھی۔ حیدر آباد کی تصویر کشمیر کے بالکل الٹ تھی یہ ہندوستان کے اندر واقع تھی، ہندو اکثریت کی اس ریاست کا حکمران مسلمان تھا۔ حیدر آباد کی خواہش آزادی و خود مختاری کے ساتھ مسلم لیگ کی بے حد وابستگی تھی۔ پاکستان کا "ک" کشمیر سے لیا گیا ہے۔ قائداعظمؒ کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ کہتے تھے۔ ہندوستان اس تاک میں تھا کہ کوئی ایسا موقعہ ملے جس سے کشمیر پر قبضہ ہو۔ غرض کہ ان دونوں ریاستوں کا الحاق حاصل کرنے کے مسئلہ پر بھی ہندوستان اور پاکستان کے زاویہ ہائے نگاہ مختلف تھے۔ اپنے مقصد کے حصول کیلئے کانگریس ہر جائز و ناجائز طریقہ استعمال کرنے پر آمادہ نظر آتی تھی۔

مسلم لیگ اس معاملے میں قانون اور آئینی طریقوں پر کاربند تھی۔ جون اور جولائی ۱۹۴۷ء میں قائداعظمؒ نے بار بار فرمایا۔

> "قانونی پوزیشن یہ کہ انگریزوں کی طرف سے انتقال اقتدار کے ساتھ اقتدار اعلیٰ ختم ہو جائے گا۔ اور سب ریاستوں کی آزاد و خود مختار حیثیت از خود بحال ہو جائے گی۔ لہٰذا ریاستوں کو آزادی ہے کہ وہ ایک ڈومینین میں شامل ہوں یا دوسری میں یا آزاد و خود مختار رہیں۔ مسلم لیگ ہر ریاست کے اس حق کو تسلیم کرتی ہے کہ وہ اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کی مجاز ہے۔ مسلم لیگ کسی ریاست کو کوئی خاص راہ عمل اختیار کرنے پر مجبور کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی"۔

پاکستان کے ایک سابق وزیر اعظم چودھری محمد علی مرحوم نے قائداعظمؒ کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "یہ محض قائداعظمؒ کی آئین پسندی کا میلان خاطر ہی نہیں تھا جس کے تحت وہ یہ اعلان کر رہے تھے بلکہ ان کا ایک مقصد حیدر آباد کی آزادی کا تحفظ بھی تھا۔ اس انداز کے اعلانات سے ممکن تھا کہ پاکستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق مخدوش ہو۔ لیکن یہ کوئی بڑا خطرہ نہیں سمجھا جاتا تھا"۔

الحاق کیلئے جغرافیائی حدود کا لحاظ

۲۵ جولائی کو وائسرائے نے ریاستوں کے حکمرانوں اور وزیروں کی ایک نمائندہ کانفرنس سے خطاب کیا۔ انہوں نے کہا کہ

> "قانونی لحاظ سے ریاستی حکمران بھارت یا پاکستان کے ساتھ الحاق

کرنے میں آزاد ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں انہیں جغرافیائی تقاضوں کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے"۔

پھر انہوں نے کہا

"آپ اس مستعمرہ کی حکومت سے بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتے جو آپ کی ہمسایہ ہے، بالکل ویسے ہی جیسے آپ اپنی رعایا سے فرار نہیں کر سکتے جس کی فلاح و بہبود کے آپ ذمہ دار ہیں"۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ دونوں میں سے کسی ایک مستعمرہ کے ساتھ الحاق کرنے میں محض والئ ریاست کی اپنی خواہش کو دخل نہیں بلکہ زیادہ اہمیت ریاست کے جغرافیائی اور دیگر روابط کو حاصل ہوگی لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے عملی طور پر بھارت کے ساتھ ریاستوں کے الحاق میں گہری دلچسپی لی اور جس طرح بن پڑا انہوں نے پاکستان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔

برِ صغیر کی سیاست کے اس انتہائی نازک دور میں قائد مسلم کانفرنس چودھری غلام عباس خان جیل میں تھے۔ حالات کی رفتار اور ۳ جون کے منصوبہ تقسیم ہند سے پیدا شدہ صورتحال سے مسلم کانفرنس کے آزاد رہنما اپنے آپ کو حیران اور پریشان پاتے تھے۔ انہیں گاہ بگاہ رہنمائی کیلئے قائد اعظمؒ کے پاس جانا پڑتا تھا۔

کشمیر کے الحاق سے متعلق قائد اعظمؒ کا موقف

۱۱ جولائی کو چودھری حمید اللہ اور پروفیسر اسحاق قریشی نے قائد اعظمؒ سے کشمیر کی صورتحال پر بات چیت کی۔ اسی روز قائد اعظمؒ نے ایک بیان میں فرمایا۔

"مسلمانانِ کشمیر اس مسئلہ پر اپنی تمام توجہ مرکوز کیے ہوئے ہیں کہ ریاست کشمیر پاکستان اور ہندوستان کی دستور ساز اسمبلیوں میں سے کس اسمبلی میں شامل ہوگی۔ میں اس سے پہلے کئی بار یہ اعلان کر چکا ہوں کہ ریاستیں پاکستان یا ہندوستان کی دستور ساز اسمبلیوں میں سے کسی ایک میں شامل ہوسکتی ہیں اور وہ چاہیں تو بالکل آزاد بھی رہ سکتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مہاراجہ کشمیر اپنی ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت اپنی رعایا کے مفاد کو بھی ملحوظ خاطر رکھیں گے"۔

الحاق کے بارے میں مسلم کانفرنس کی پہلی قرارداد

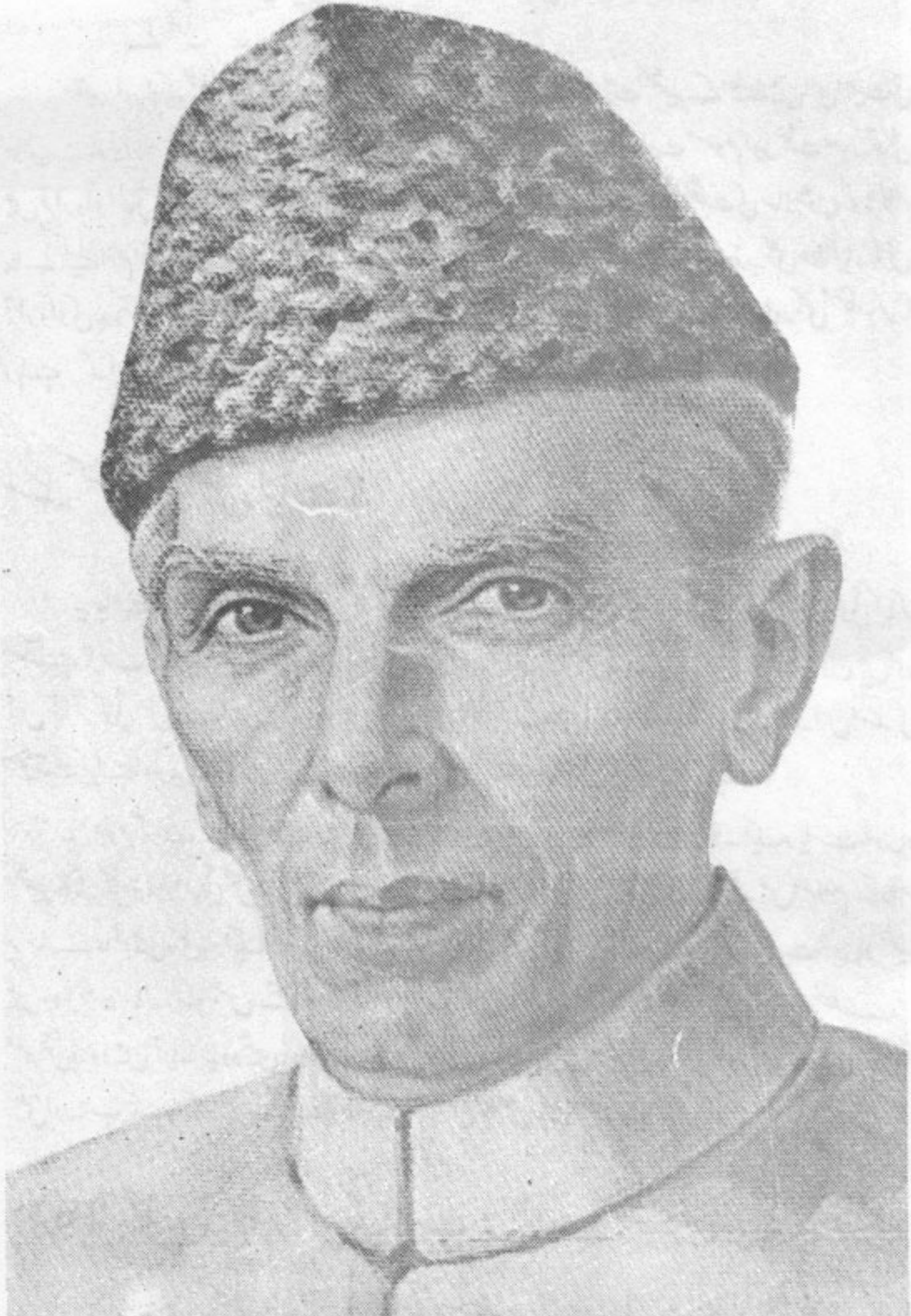
دہلی میں قائداعظمؒ سے ملاقات کے بعد چودھری حمیداللہ خان ۱۸ جولائی کو سری نگر پہنچے۔ ۱۹ جولائی کو سری نگر میں مسلم کانفرنس کا ایک کنونشن منعقد ہوا جس میں چودھری حمیداللہ خان نے اس مفہوم کی ایک قرارداد پیش کی کہ کشمیر کو خودمختار رکھا جائے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اگر مہاراجہ خودمختاری کا اعلان کر دیں تو کانگریس ریاست پر ڈورے ڈالنے چھوڑ دے گی اور تقسیم کے بعد مسلم آبادی اور جغرافیائی محل وقوع کی بناء پر ریاست خودبخود پاکستان کی جھولی میں چلی جائے گی۔ قائداعظمؒ سے یہ فقرہ منسوب ہوتا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ "ریاست کشمیر ہماری جھولی میں پکے ہوئے پھل کی طرح آ گرے گی"۔ لیکن یہ اس صورت میں ممکن تھا کہ اگر ریڈکلف نے آگے چل کر منصفانہ فیصلہ دیا ہوتا اور ہندوستان کیلئے کشمیر میں داخل ہونے کا چور دروازہ نہ کھولا ہوتا۔ چودھری حمیداللہ خان کے مقابلے میں عبدالرحیم دُرّانی صاحب کی قرارداد اتفاق رائے سے منظور کی گئی۔ جس کا متن حسب ذیل ہے:۔

"آل جموں اینڈ کشمیر مسلم کانفرنس کے کنونشن کا یہ اجلاس قائداعظمؒ کی کامیابی پر اطمینان کا اظہار کرتا ہے اور انہیں مبارکباد پیش کرتا ہے۔

ہندوستان کی ریاستوں کے عوام کو یہ امید تھی کہ وہ بھی برٹش انڈیا کے عوام کے شانہ بشانہ آزادی کے حصول کی منزل کی طرف رواں ہوں گے۔ ہندوستان کی تقسیم عمل میں آ جانے کے بعد برٹش انڈیا کے عوام آزادی حاصل کر چکے ہیں لیکن ۳ جون ۱۹۴۷ء کے اعلان نے ہندوستانی مہاراجوں کے ہاتھ مضبوط کر دیئے ہیں اور جب تک مہاراجے وقت کی آواز پر لبیک نہ کہیں گے، ہندوستانی ریاستوں کے عوام کا مستقبل تاریک رہے گا۔ اس وقت جموں و کشمیر کے عوام کیلئے صرف تین راستے کھلے ہیں۔

۱۔ وہ بھارت کے ساتھ الحاق کر لیں۔
۲۔ یا پاکستان کے ساتھ الحاق کر لیں۔
۳۔ یا پھر آزاد رہیں۔

"مسلم کانفرنس کا یہ کنونشن اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ جغرافیائی حالات، مجموعی آبادی کی اسی فیصد مسلم اکثریت، پنجاب کے اہم دریاؤں کی ریاست میں سے گزر گاہیں، لسانی، ثقافتی، نسلی اور معاشی تعلقات اور ریاست کی سرحدوں کا پاکستان کی سرحدوں سے اشتراک۔ یہ سب حقائق اس امر کو



قائداعظم محمد علی جناح (بانیٔ پاکستان)

ضروری قرار دیتے ہیں کہ ریاست جموں و کشمیر پاکستان کے ساتھ الحاق کر لے"۔

مقصد اور لائحہ عمل کے اعتبار سے ۱۹ جولائی کی قرارداد تحریک حریت کشمیر کے سلسلے میں اسی اہمیت کی حامل ہے جو قرارداد لاہور کو تحریک پاکستان کے سلسلے میں حاصل ہے۔ نہایت مسموم اور سخت صورتحال میں قرارداد الحاق پاکستان منظور کر کے مسلم کانفرنس نے جہاں ہندو فرنگی ملی بھگت کی سازشوں کو ناکام بنانے کیلئے اہم اقدام کیا' وہیں تحریک کشمیر کو ایک منزل اور اس منزل تک پہنچنے کا نیا جذبہ بھی عطا کیا۔ اس قرارداد کی بدولت صفحہ ہستی پر طلوع ہونے والا ہر دن اہل کشمیر کے اس ایمان اور یقین کو اور بھی مستحکم کرتا رہا ہے کہ ان کی آزادی کی تحریک کا واحد مقصد تمام ریاست کا پاکستان سے الحاق ہے۔

مسئلہ کشمیر دراصل کیا ہے؟

یہ جاننے کے لئے کہ مسئلہ کشمیر کا حل کیا ہے اور کون اس کیلئے کیا کام کر رہا ہے یا یہ کہ کوئی کیا کر سکتا ہے؟ سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ یہ مسئلہ دراصل ہے کیا۔ اس کے فریق کون ہیں اور اس کا اگر کوئی حل ہے تو اس میں رکاوٹیں کیا کیا ہیں؟ اس کے علاوہ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اس مسئلہ کی حقیقت کیا ہے اور یہ کہ دکھائی کیا دیتا ہے' کیونکہ ہر شخص کو ان تفاصیل کی خبر نہیں ہے۔

یہ معلوم کرنے کیلئے یہ مسئلہ دراصل ہے کیا' دو تین امور پر لازماً غور کرنا ہو گا۔ ایک ریاست جموں و کشمیر کا تاریخی و جغرافیائی محل وقوع' دوسرے ۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم جس کے نتیجہ میں اسلام کے نام پر سارے عالم میں پہلی بار ایک نظریاتی مملکت معرض وجود میں آئی اور تیسرے یہ کہ ریاست جموں و کشمیر میں وہ ڈیڑھ سالہ جہاد جس کے ذریعہ آزاد کشمیر و شمالی علاقہ جات کا ۳۲ ہزار مربع میل کا خطہ معرض وجود میں آیا۔ یہ وہ تین بنیادی عناصر ہیں جنہیں سمجھے بغیر اس مسئلہ کی اصل صورت سمجھ میں نہیں آ سکتی اور جب تک وہ سمجھ میں نہ آئے تو ظاہر ہے کہ اس کا حل کیسے معلوم ہو گا؟

جغرافیائی محل وقوع اور اس کی اہمیت

ریاست جموں و کشمیر کے محل وقوع کا ذکر اسلئے کرنا پڑا کہ اس پر ایک ہی نگاہ ڈالنے سے عیاں ہو گا کہ غالب مسلم اکثریت کا تقریباً ۸۴ ہزار مربع میل کا یہ علاقہ پاکستان' چین' بھارت اور روس کی سرحدات سے متصل ہے اور اپنی خصوصی جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے ان ملکوں کے مابین کسی بھی جنگ کی صورت میں کسی کیلئے اس پر قبضہ بیشمار فوائد اور دوسرے فریق پر سبقت و غلبہ کا باعث بن سکتا ہے۔ اسی طرح

تاریخی، جغرافیائی اور تمدنی عوامل کے اعتبار سے اس علاقہ کا گہرا تعلق صرف پاکستان سے بنتا ہے۔ مسلمانوں کی غالب اکثریت پر مشتمل یہ ریاست اپنی تہذیب، ثقافت و تمدن، مذہب، تجارت غرضیکہ ہر اعتبار سے ان متصل علاقوں کے ساتھ وابستہ رہی ہے جن کو تقسیم ہند کے بعد پاکستان کہا جاتا ہے۔ اور اسی طرح پاکستان کی معیشت اور دفاع کا کافی حد تک انحصار اسی علاقے جموں و کشمیر پر ہے۔ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے، جسکی تشریح قائداعظمؒ کا مشہور قول کرتا ہے کہ "کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے اور کوئی باغیرت قوم اپنی شہ رگ دشمن کی تلوار کے نیچے نہیں رکھ سکتی۔ بھارت، افغانستان اور روس کے ساتھ کشمیر کی ملنے والی سرحدات کے مجموعے سے ریاست کا کہیں زیادہ علاقہ یعنی دو صد میل سے زائد علاقہ پاکستان کے ساتھ متصل ہے اس قدرتی تقسیم میں جہاں کشمیر کا سارا دارومدار پاکستان پر ہے، وہاں خود پاکستان کی معیشت اور دفاع کا نہایت گہرا تعلق خود کشمیر سے ہے، یہاں تک کہ بالفاظ دیگر جب تک کشمیر پاکستان کے ساتھ شامل نہیں ہو جاتا تب تک پاکستان اپنی جغرافیائی، نظریاتی، تاریخی، معاشی اور دفاعی سرحدات میں مکمل نہیں ہے۔ ان بنیادی عوامل میں ہر ایک پر ایک علیحدہ مقالے کی ضرورت ہے تاکہ یہ سمجھ آئے کہ پاکستان کی معیشت اور ثقافتی و تہذیبی و تاریخی معاملہ کیا ہے اور پاکستان کے دفاع کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے اس توجیہہ سے سمجھنے کی بات دراصل یہ ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کوئی علیحدہ ملک نہیں ہے نہ کشمیری کوئی علیحدہ قوم ہیں کہ ان کو آزاد کروا کر کسی دوسری مملکت اور دوسری قوم کے ساتھ ملانا مقصود ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سوچ و فکر کی ادنیٰ سی غلطی سے تمام مقاصد ہی بدل جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب مقاصد بدل جائیں تو طریق کار بھی ان ہی کے مطابق ہو گا۔ بھارت کے ساتھ ریاست کا الحاق ایک انتہائی غیر طبعی اور غیر فطری عمل ہے جبکہ پاکستان کے ساتھ الحاق طبعی اور فطری امر ہے بلکہ اس اعتبار سے پاکستان کیساتھ کشمیر کا الحاق پاکستان کے کئی دوسرے ملحقہ حصوں سے زیادہ فطری اور طبعی ہے اور کشمیر قدرتی اعتبار سے پاکستان کا جزو لاینفک ہے۔ بھارت کا یہ دعویٰ کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے محض لغو، بے بنیاد اور بلاجواز ہے۔ سوائے اس کے کہ کشمیر پر بھارت کا فوجی قبضہ ہے اور تاریخ اس کی شاہد ہے کہ بھارت نے سازش، فریب، تشدد اور فراڈ کے ذریعہ کشمیر پر قبضہ کیا اور اس میں لارڈ مونٹ بیٹن، گاندھی، نہرو اور رسوائے زمانہ ریڈ کلف خاص طور پر شامل تھے۔

برصغیر کی تقسیم اور ریاستوں کا الحاق

آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس ہی وہ واحد سیاسی جماعت ہے جس کا کردار بہت واضح طور پر قومی اور ملی امنگوں کا آئینہ دار رہا ہے اور اس کے مخلص اور ایثار پیشہ قائد رئیس الاحرار قائد ملت چوہدری غلام عباس اور کارکنوں کی تاریخ ساز حیثیت تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ تابندہ رہے گی۔ اب تقسیم ہند کی

تحریک یا تحریک پاکستان پر مختصر سی نظر ڈالئے۔ جب دو قومی نظریہ کی بناء پر یہ تاریخی تقسیم ہوئی تو اس وقت ہندوستان میں موجود چھ صد سے زائد دیسی ریاستوں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ اپنی مرضی سے بھارت یا پاکستان میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس سے عملاً مقصود یہی ہو سکتا تھا کہ جو ریاستیں ہمسایہ ملک کا طبعی حصہ ہو سکتی تھیں وہ اسی ملک سے الحاق کریں گی نہ وہ ریاست جو بھارت کے اندر تھی پاکستان سے عملاً الحاق کر سکتی تھی نہ وہ جو پاکستان کے اندر تھی بھارت میں شامل ہو سکتی تھی ورنہ دونوں حصوں کا نقشہ ہی مختلف ہوتا۔ بھارت میں ایسی بڑی ریاستیں تھیں جن کے حکمران مسلمان تھے وہ پاکستان کے ساتھ الحاق کر لیتے مگر بھارت نے ان پر جبراً قبضہ کر لیا مثلاً حیدر آباد جونا گڑھ' بھوپال اور مناددر غیرہ۔ اسی اصول کی بنیاد پر ریاست جموں و کشمیر بھی جو جغرافیائی اعتبار سے بھی اور آبادی کی غالب اکثریت کی رائے کی بنیاد پر بھی پاکستان کے متصل تھی اس کے ساتھ الحاق کر سکتی تھی بلکہ اس میں ایک امتیازی اور اضافی خصوصیت یہ بھی تھی کہ دوسری تمام ریاستوں کے برعکس اس ریاست میں پاکستان بننے سے قبل ہی یعنی ۱۹ جولائی ۱۹۴۷ء کو سری نگر کے مقام پر ریاست کے مسلمانوں کی نمائندہ اور ترجمان جماعت آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس نے پاکستان کے ساتھ الحاق کی قرارداد بھی منظور کر لی بلکہ پاکستان بننے سے پہلے ہی الحاق پاکستان کیلئے ایک عوامی تحریک چل پڑی تھی۔ اگر ریاست جموں و کشمیر اس وقت پاکستان میں شامل ہو گئی ہوتی تو پاکستان مکمل ہو جاتا اور برصغیر کے عوام مسلسل کشمکش اور باہمی دشمنی کی سزا سے بچ جاتے۔

مسئلہ کشمیر میں انگریز کا کردار

یہ امر قابل ذکر ہے کہ پاکستان کا معرض وجود میں آنا بھارت کے ہندو لیڈروں کے علاوہ خود اس وقت کے حکمران انگریز کو بھی ناگوار تھا۔ وہ اپنے ہاتھ سے ایک مسلم ریاست کو کیسے قائم کر کے جاتا جبکہ ہندوستان کی ہندو اکثریت کیلئے تو یہ زندگی اور موت کا مسئلہ تھا کیونکہ ان کے وہ سب لیڈر جو ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی واپس اپنے مذہب پر لانے کے پروگرام بنا رہے تھے' اپنے ہی دروازے پر پاکستان کے نام سے ایک عظیم مسلم ریاست کے قیام کو کیسے گوارا کر سکتے تھے۔ تمام واقعات اور شواہد اس امر کے تاریخی گواہ ہیں کہ عین اس وقت جب کہ پاکستان بن رہا تھا' ہندو اور انگریز کی ملی بھگت سے پاکستان کی تخریب کے منصوبے بھی تیار کر لئے گئے تھے جس میں سرفہرست اس بددیانت انگریز ثالث ریڈ کلف کا ایوارڈ ہے جس کے ذریعہ گورداسپور کا ضلع ایک معروف سازش کے تحت بھارت کو دے دیا گیا ورنہ بھارت کی سرحد کسی جگہ بھی کشمیر سے نہیں ملتی تھی اور اس طرح کشمیر پر بھارت کا سرے سے کوئی دعویٰ ہی نہیں تھا۔ چنانچہ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت اس ضلع کے ذریعہ بھارت کو ریاست میں فوجی راستہ دیا گیا تا کہ وہ اپنی فوج بھیج کر ریاست پر قبضہ کر سکے بلکہ اس سازش کو اور زیادہ مستحکم اور کامیاب کرنے کیلئے تقسیم

کے وقت پاکستان کے حصہ میں آنے والی فوج اور اس کا اسلحہ پورے بھارت میں اس طرح منتشر کر دیا گیا تھا کہ وہ سب کافی دیر تقریباً ایک سال تک بھارت کے قبضہ میں ہی رہا تا کہ پاکستان کشمیر میں کوئی جوابی فوجی کارروائی نہ کر سکے۔ بالاختصار یہ کہ اگر گورداسپور کا ضلع بد دیانتی سے بھارت کو نہ دیدیا جاتا تو بھارت کا کشمیر کے ساتھ سرے سے کوئی تعلق نہ ہوتا اور کشمیر خود بخود اپنے مذکورہ عوامل کی بناء پر پاکستان کا حصہ بن جاتا اور اس طرح پاکستان کو اس کی مطلوبہ سرحدات میں مکمل کر دیتا اور اس طرح ہندو لیڈروں کا ہوس ملک گیری کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوتا اور نہ وہ مکروہ کشمکش باقی رہتی جس کی بناء پر بھارت نے اپنی فوجی اور مادی اور سیاسی صلاحیتوں کو اپنے ہمسایہ ملکوں کے ساتھ مسلسل دشمنی کی فضا قائم رکھنے کیلئے صرف کر رکھا ہے۔

حق خودارادیت

اس حقیقی اور تاریخی تجزیئے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسئلہ کشمیر در حقیقت اسی تحریک پاکستان کا حصہ ہے جس نے ہندوستان کو تقسیم کیا اور بین الاقوامی سطح پر اس کی صورت یہ ہے کہ جبکہ متحدہ ہندوستان کے کروڑوں عوام کو حق خودارادیت ملا وہاں کشمیری عوام ابھی تک اس حق سے محروم ہیں۔ حالانکہ کشمیری عوام نے ۱۹۳۱ء سے ہی اپنے حقوق کے حصول کیلئے تحریک حریت شروع کی تھی جس کی حمایت علامہ اقبالؒ اور دیگر سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کی سرکردگی میں مسلم انڈیا نے کی تھی۔ اس ضمن میں ایک اور تاریخی واقعہ ناقابل فراموش ہے۔ وہ واقعہ مسئلہ کشمیر کی اس حیثیت کی مزید تصدیق بھی کرتا ہے کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء یعنی پاکستان بننے کے وقت ریاست جموں و کشمیر بھر میں تحریک پاکستان کے نام پورے پندرہ ماہ مسلح جہاد جاری رہا جس کے نتیجہ میں ۳۲ ہزار مربع میل ریاست آزاد ہوئی جس کو آزاد کشمیر اور گلگت وبلتستان کہتے ہیں۔ اسطرح نہ صرف تاریخی تسلسل اور جغرافیائی اعتبار سے کشمیر کی پاکستان کے ساتھ لازوال وابستگی کا پتہ چلتا ہے بلکہ ایک مسلح جہاد کے ذریعہ اس خطہ کے عوام نے پاکستان کے حق میں اپنی رائے کا اظہار بھی کیا یہ امتیاز بھی صرف ان ہی حریت پسند لوگوں کو حاصل ہے کہ انہوں نے نہ صرف اپنی سیاسی رائے یعنی ووٹ سے بلکہ تلوار سے بھی یہ تاریخی فیصلہ صادر کیا کہ وہ پاکستان کا حصہ ہیں اور اگر وہ جنگ ایک دھوکے سے بند نہ کروادی جاتی تو ریاست کے لوگ بھارت سے لڑ کر آزادی حاصل کر لیتے اور پاکستان کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ یہ ناقابل تردید تاریخی واقعہ ہے کہ ریاست کے لوگ جس وقت پاکستان کے نام پر لڑ رہے تھے تو ان کا مقابلہ صرف بھارتی فوج کر رہی تھی اور ڈوگرہ فوج تقریباً دم توڑ چکی تھی۔ کشمیر کا وہ حصہ جو بھارتی فوجوں کے تسلط میں رہا، وہاں کے باشندوں نے ہمارے خلاف جنگ نہیں لڑی بلکہ مجاہدین آزادی سے تعاون کیا۔ اسی کشمکش میں مہاراجہ نے بھارت کے ساتھ

الحاق کا اعلان کر دیا۔ جس کی ایک بڑی وجہ ریاست میں کانگریسی حکمرانوں کی ریشہ دوانیاں اور بھارتی فوجوں کی یلغار تھی یہی وہ پس منظر ہے جس میں مسئلہ کشمیر سلامتی کونسل میں پیش ہوا اور بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ موقف کی رو سے یہ طے ہوا کہ ریاست کے لوگوں کو پاکستان یا بھارت کے ساتھ الحاق کرنے کا حق دیا جائے گا اور اسی تصفیہ کے تحت پہلی جنوری ۱۹۴۹ء کو جہاد آزادی روک دیا گیا۔ آج بھی ہم وہیں کھڑے ہیں اور اس وقت تک پیچھے نہیں ہٹیں گے جب تک کشمیریوں کو ان کا یہ پیدائشی حق نہ ملے جس کا وعدہ اقوام متحدہ کے کشمیر کمیشن کی ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء اور ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی قراردادوں میں اہل کشمیر کے ساتھ کیا گیا ہے ان قراردادوں کی تعبیر و تفسیر اصل میں یہ ہے کہ ریاست جموں و کشمیر سے تمام غیر ملکی فوج اور عناصر نکل جائیں اور اقوام متحدہ کے مقرر کردہ ناظم رائے شماری کی نگرانی میں کشمیریوں سے الحاق کے مسئلہ پر رائے دریافت کی جائے۔

الحاق پاکستان کی بنیاد

اب یہ بات قدرے واضح ہو گئی ہے اور قابل غور بھی ہے کہ پاکستان کی طرف سے کشمیریوں کے حق خودارادیت کے بارے میں جو بات کی جاتی ہے وہ محض اسی قدر نہیں ہے کہ دنیا کے کسی حصے میں ہم فیشن یا اصول کے طور پر آزادی کی تحریکوں کی حمایت کرتے رہتے ہیں بلکہ اس حمایت کی بنیاد بالکل مختلف ہے۔ اس کے پس منظر میں ایک تو وہ جغرافیائی اور قدرتی رشتہ ہے، دوسرے یہ کہ ریاست کے عوام خود پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتے ہیں جس کی وکالت بین الاقوامی سطح پر پاکستان کرتا رہا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ خود بھارت نے نہایت چالاکی سے پاکستان کو حملہ آور قرار دے کر پاکستان کو فریق بناڈالا مگر بنیاد یہ رکھی کہ ریاست کے لوگ اپنی مرضی سے فیصلہ کریں کہ وہ پاکستان اور بھارت میں سے کس کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ اگر کشمیر اور پاکستان کے درمیان اخوت کی بناء پر گہرے بندھن کا معقول جواز نہ ہوتا تو بھارت جیسے مستحکم بڑے اور باوسائل ملک کے ساتھ پاکستان کا یہ جھگڑا محض مذاق بن کر رہ گیا ہوتا۔ پاکستان کا کشمیر کے ساتھ یہی وہ اٹوٹ رشتہ ہے جو بھارت کی عین کمزوری ہے۔ خدانہ کرے اگر یہ رشتہ کسی وجہ سے کمزور ہو جائے تو پاکستان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز سے بھی زیادہ کمزور ہو جاتی ہے۔

اہل کشمیر کا غیر متزلزل عزم

دین اسلام کی پیروکار ریاست کی غالب آبادی ابھی تک پاکستان کے ساتھ الحاق کی بات پر قائم ہے ورنہ اگر اس میں سر مو بھی شک ہوتا تو بھارت استصواب رائے سے کبھی انحراف نہ کرتا۔ اس طرح یہ



فیلڈمارشل محمد ایوب خان

بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کے لوگوں کی غالب اکثریت اب بھی پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتی ہے اور وہ بدستور تحریک پاکستان پر قائم و دائم ہے۔ تو جب ہم الحاق پاکستان کی بات کرتے ہیں تو وہ محض کوئی جماعتی یا سیاسی نعرہ نہیں ہے جیسے انتخابات میں عارضی اور وقتی نعرے ایجاد کئے جاتے ہیں۔ بلکہ یہ ایک تاریخی عمل اور اس کے تسلسل کا حصہ ہے۔ یہ دو قومی نظریے کی صدائے بازگشت ہے اور ایک ایسا مقدس مشن ہے۔ جس پر پندرہ ماہ تک جنگ لڑی گئی اور ہزاروں مجاہدین نے اپنا مقدس خون نچھاور کیا اور اپنا سب کچھ قربان کر دیا یہ ایسا مبارک عمل ہے کہ ریاست کے مسلمانوں نے بے دریغ اپنا خون بہایا، گھر بار لٹا دیئے اور تحریک الحاق پاکستان کی تاریخ کو اپنے خون سے رقم کیا جس کو بھارت جیسے بڑے ملک کے وسائل، ذہنی و فکری و فوجی قوت اور بین الاقوامی اثر و رسوخ آج تک ختم نہیں کر سکا۔ اگر کشمیریوں کا پاکستان کے ساتھ الحاق محض ایک دوسری قوم یا دوسرے ملک کے ساتھ الحاق کی تحریک ہوتی تو دنیا بھر میں ایسی کسی دوسری تحریک کی کوئی ایک مثال تو دی جا سکتی۔ اگر یہ الحاق کی تحریک ایک فطری اور طبعی امر نہ ہوتا تو نہ یہ اتنی طویل مدت تک قائم رہ سکتی نہ اس میں کوئی کشش باقی رہتی۔ نہ اس پر کوئی قربانی دی جاتی۔ اس مقدس تحریک کی فطرت میں اتنی لچک ہے کہ جتنا اس کو دبایا جائے یہ اتنا ہی ابھرے گی یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی بھی مصنوعی اور فرضی تحریک کو عارضی طور پر ابھارا تو جا سکتا ہے لیکن کوئی بھی مادی طاقت اپنے زور سے اس تسلسل کے ساتھ اسے قائم نہیں رکھ سکتی۔ نہ ایسی کوئی مثال ہے۔ اس کا ایک اور نہایت لطیف پہلو یہ بھی ہے کہ خود پاکستان کے اندر کہ جس ملک کی اپنی سلامتی بھی اس تحریک سے وابستہ ہے، وہاں سے بھی اس تحریک کی کوئی امداد نہیں ہوئی بلکہ عمداً و سہواً اس کی بھرپور عملی مخالفت ہی ہوتی رہی یہ ایک طرف نہایت تکلیف دہ امر ہے تو دوسری طرف اس تحریک کی سچائی اور اس کے تقدس کا طرۂ امتیاز ہے۔ ایک تیسرا امر معروف یہ ہے کہ اس کے باوجود اس تحریک کو ختم یا کمزور نہیں کیا جا سکا اور اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود بھارت نے صرف سرزمین کشمیر پر محض فوجی قبضہ کر رکھا ہے، وہ کشمیریوں کی روح کو غلام بنانے میں سراسر ناکام رہا ہے۔ کیا یہی اس تحریک کی صداقت اور اس کے طبعی اور فطری ہونے کی یہی کافی دلیل نہیں؟ اور کیا اب بھی کسی کو اس میں شک ہے کہ کشمیر کی تقدیر پاکستان کے ساتھ ہے، تاریخ پاکستان کے ساتھ ہے اور کشمیری عوام پاکستان کے ساتھ ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

آیئے ایک دوسرے پہلو پر بھی غور فرمایئے۔ جو لوگ تحریک پاکستان سے آگاہ نہیں ہیں اور خاص کر جن کو ریاست جموں و کشمیر میں اس تحریک کا کماحقہ علم نہیں ہے، وہ بجا طور پر سوال کر سکتے ہیں کہ ریاست کے مسلمان بھی ہندوستان میں پاکستان بننے کی تحریک کی جذباتیت سے متاثر تھے خصوصاً قائداعظمؒ کی وجہ سے، ورنہ ریاست کے لوگوں کا طرز عمل مختلف ہوتا۔ تو میں بتانا چاہتا ہوں کہ اگرچہ قائداعظم کی قیادت کے اعجاز کی بدولت اور اسی تحریک سے جبکہ خود وہ مسلمان بھی یعنی ہندو اکثریتی صوبوں

کا مسلمان جس نے پاکستان میں آنا ہی نہیں تھا وہ بھی نہ صرف جذباتیت سے متاثر تھا بلکہ سب سے زیادہ قربانی اسی نے دی تو پھر ریاست جموں وکشمیر کے مسلمانوں کا اپنے خصوصی محل وقوع، تاریخی عوامل اور مذہبی رجحانات کے باعث متاثر ہونا محض طبعی امر ہے لیکن تاریخی واقعات یہ بتاتے ہیں کہ ریاست کے لوگوں کا یہ فیصلہ محض جذباتی نہیں تھا بلکہ نہایت سوچا سمجھا ایک تاریخی تسلسل کا حصہ تھا۔ درمیان میں کسی حادثے کے باعث ایسا نہیں ہوا۔

خودمختاری اور دارالسلام کے پس پردہ تخریبی عزائم

شیخ محمد عبداللہ صاحب سے ہم لوگ دسویں جماعت کے طالب علموں کے ایک وفد میں ۱۹۴۲ء میں پونچھ میں ملے تو اس وقت وہ ایک خودمختار ملک کی بات کر رہے تھے۔ جو اس وقت کے حالات میں ایک ناقابل فہم بات تھی۔ انہوں نے بہت دلائل دیئے کہ یہ ممکن ہے، تاہم ریاست کی خودمختاری کی تحریک اسوقت بھی موجود تھی اور اس کا داعی کوئی معمولی شخص نہیں بلکہ شیخ محمد عبداللہ تھا اور غالباً یہی وہ وقت ہے جب روس نے ایشیا کی سلامتی (ایشین سکیورٹی پلان) کے نام پر منصوبہ بنایا تھا جس میں کشمیر، سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک بفرزون بنانا مقصود تھا۔ یہی نہیں بلکہ جوں جوں پاکستان کا قیام قریب آتا گیا۔ یہ خودمختاری کی تحریک نمایاں ہوتی گئی حتیٰ کہ ہندو کانگریس اور ایک حد تک ریاست کی حکومت بھی اس کی حمایت کرنے لگی۔ ان دونوں کا مقصد واضح تھا کہ کسی بہانے سے ریاست کے لوگوں کو بننے والے پاکستان کے ساتھ الحاق سے عارضی طور پر روک دیا جائے تاکہ بھارت کو فوجی قبضہ کے لئے مناسب وقت مل جائے۔ اس کے علاوہ اگرچہ یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ کچھ لوگ اس راستے سے پاکستان میں مداخلت کے لئے بھی وقت لینا چاہتے تھے۔ اس تحریک کی پشت پناہی بلکہ رہنمائی ایک معروف گروہ (قادیانیوں) نے بھی شروع کر رکھی تھی۔ اور "دارالسلام" کے نام سے ریاست کو ایک علیحدہ مملکت بنانے کے پروگرام پر کام ہو رہا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں کون ایسا کور دماغ اور شقی القلب ہو گا جو ریاست کے مسلمانوں کی سیاسی بصیرت اور ان کے شدید مذہبی لگاؤ کا انکار کرے اور یہ تسلیم نہ کرے کہ بیشمار مخالف عناصر اور ان کی کارستانیوں کے علی الرغم انہوں نے پاکستان کے ساتھ وابستگی کا فیصلہ کیا اور کون ہے، جو ریاست کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کی عظمت اور اس کی تاریخی کردار اور اس تاریخی فیصلہ کی اہمیت سے انکار کرے، جو ۱۹ جولائی ۱۹۴۷ء کو مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل نے سری نگر کے اجلاس میں کیا۔ حالانکہ عین اس موقعہ پر جب یہ تاریخی فیصلہ ہونے والا تھا اور رئیس الاحرار چودھری غلام عباس خان مع رفقاء قید تھے تو قائداعظمؒ کے پیڈ پر قائداعظمؒ کے ذاتی سٹاف کے ہمارے ہی ایک ریاستی نوجوان نے مسلم کانفرنس کے زعماء کے نام دلی سے ایک گمراہ کن خط لکھا جس

میں یہ تاثر دیا گیا تھا کہ خود قائد اعظمؒ بھی ریاست کی خود مختاری چاہتے ہیں جب کہ قائد اعظمؒ کے نام پر اور ان ہی کی بھرپور پشت پناہی سے ریاست، مسلمان پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کی تحریک چلا رہا تھا چنانچہ جب ان ہی کے پیڈ پر ان ہی کے دفتر سے اس نوعیت کا خط لکھا گیا تو اسی خط کے اثر سے مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ نے ۱۸ جولائی ۱۹۴۷ء کو خود مختاری کی قرار داد بھی پاس کر لی لیکن دوسرے ہی دن جنرل کونسل نے اس کو مسترد کر کے الحاق کے حق میں قرار داد پاس کی بلکہ ساتھ ہی اس وقت کی مرکزی تنظیم کے خلاف عدم اعتماد بھی کر دیا۔ لیکن ان کو عارضی طور پر کام کرنے کی اجازت دے دی گئی۔آج مسلم کانفرنس کے ان عظیم رہنماؤں اور کارکنوں کی بصیرت کا کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے جنہوں نے اس سازش کو بروقت بھانپ لیا اور علیحدگی پسندانہ نظریہ کو مسترد کر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی تاریخی قرارداد پاس کی اور تاریخ کا رخ ہی بدل دیا اور اسطرح وہ مقدس فریضہ ادا کیا جس کی جتنی سپاس گزاری کی جائے،کم ہے۔ وہ ایک احسان عظیم تھا جو پروردگار عالم کی بے پایاں تائید و حمایت اور رہنمائی سے اس وقت اس پوری قوم پر کیا گیا۔

اس گزارش کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ یہ جو الحاق پاکستان کی تحریک چل رہی ہے،کوئی حادثہ نہیں ہے نہ کوئی جذباتی فیصلہ ہے، نہ کوئی سیاسی مصلحت ہے، نہ یہ تحریک کسی حکومت یا سیاسی جماعت نے کسی عارضی سیاسی فائدہ کی غرض سے چلائی ہوئی ہے بلکہ یہ تحریک ایک ناقابل تقسیم تاریخی عمل اور ورثہ ہے جو ایک تسلسل کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ جس کی خاطر ریاست اور پاکستان کے عوام نے بے پناہ قربانیاں دی ہیں۔ ریاست کے مسلمانوں نے جب یہ فیصلہ کیا تھا تو دوسرے تمام متبادل راستے ترک کر کے کیا تھا نہ یہ کہ ان سب میں یہ بھی ایک راستہ تھا جس کو کسی مجبوری سے اختیار کیا گیا تھا یا کسی متبادل کے نہ ہونے کی صورت میں ایسا کیا گیا۔ اس اعتبار سے یہی تحریک ریاست جموں وکشمیر کے مسلمانوں کی واحد حقیقی تحریک ہے۔ اسی پر وہ اس وقت تک قائم ہیں اور یہی تحریک تکمیل پاکستان کا راستہ بھی ہے۔ اسلئے یہ کہنا بھی کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ اس تحریک کے خلاف یا اس کے علاوہ جو بھی تحریکیں اٹھی ہیں، یا اٹھیں گی وہ غیر فطری ،نقصان دہ اور محض اسلام اور پاکستان کے دشمنوں کے مقاصد کی ہی ترجمانی کر سکتی ہیں۔

ایک دلچسپ واقعہ

۱۹۷۲ء کا ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا،سری نگر سے ہوتا ہوا ایک معروف امریکی صحافی مظفر آباد آیا۔ میں ان دنوں صدر تھا،مجھ سے مل کر کہنے لگا کہ میں شیخ محمد عبداللہ صاحب سے مل کر آرہا ہوں۔ مجھے شیخ صاحب کی بات صحیح سمجھ میں نہیں آئی۔ شاید تم سمجھا سکو۔ کہنے لگا کہ شیخ صاحب ایک ہی سانس میں کہتے ہیں کہ "مجھے فخر ہے کہ میں نے کشمیر کو بھارت کی گود میں ڈالا"۔ پھر کہتے ہیں کہ "بھارت ہمارے ساتھ



شیخ محمد عبداللہ

مقبوضہ علاقہ کا سا سلوک کر رہا ہے"۔ پھر کہنے لگا کہ اس سے بھی عجیب تر یہ کہ ہم جب گاڑی میں سفر کر رہے تھے تو گاڑی کے ڈرائیور کی جانب شیخ صاحب نے اشارہ کر کے کہا کہ آپ نے یہ دیکھا ہے۔ یہ ایسا ویسا میرا ڈرائیور اگر استصواب ہو تو یہ بھی پاکستان کو ہی ووٹ دے گا" اس پر میں نے کہا کہ شیخ صاحب کے تضادات کا مفہوم شاید خود ان کو بھی سمجھ میں نہ آتا ہو گا ہم کیسے سمجھیں۔ الحاق پاکستان کی تحریک کا طبعی اور فطری ہونا اس چھوٹی سی مگر نہایت اہم مثال سے بھی ظاہر ہے اور یہ ہے وہ دل کی بات جو بھارت پر بھی آشکار ہے اور جس کے بارے میں ہمارے ہاں شکوک پیدا کئے جاتے رہے ہیں۔ مگر جس کو ابھی تک کوئی بد معاملگی، کوئی طاقت اور کوئی دباؤ تبدیل نہیں کر سکا۔ ان کی کوئی ایک مثال نہیں، درجنوں، سینکڑوں بلکہ ہزاروں مثالیں دی جا سکتی ہیں، کیونکہ یہ ہماری روزمرہ زندگی میں شامل ہے۔

مسئلہ کشمیر کب اور کیوں پیدا ہوا؟

دنیا کے کئی دوسرے بڑے بڑے حل طلب مسائل کی طرح مسئلہ کشمیر بھی ایک بڑا بین الاقوامی مسئلہ ہے اور عین انہی مسائل کی طرح جنہیں کچھ لوگ اپنے اپنے مقاصد کے پیش نظر حل کرنے کے خواہشمند ہیں اور کچھ لوگ جوں کی توں حالت میں ہی دیکھنا پسند کرتے ہیں مسئلہ کشمیر بھی ۱۹۴۷ء سے لیکر آج تک ایسی ہی ظالمانہ کشمکش کا تختہ مشق بنا ہوا ہے اور کشمیر کے ایک کروڑ عوام اسی مشق ستم کا ہدف ہیں۔ اس مسئلہ میں کشمیری عوام بلاواسطہ پاکستان اور بھارت بالواسطہ شریک بلکہ فریق ہیں۔ جبکہ اقوام متحدہ، اس کی سلامتی کونسل اور اس وجہ سے چند بڑی طاقتیں بھی اس مسئلہ میں پوری دلچسپی رکھتی ہیں۔ جس طرح کشمیری عوام اس پورے عرصے میں اس مسئلہ کو حل کرنے کیلئے مسلسل قربانیاں دیتے آرہے ہیں، اسی طرح دوسری طاقتیں بھی اس مسئلہ کو بدستور الجھائے رکھنے میں کوشاں ہیں۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنی زبردست کشمکش اور یہ طویل المیعاد تعطل اپنا اثر نہ دکھائے؟ اس اثناء میں بہرحال یہ کشمکش یا جنگ ذہنی اور جسمانی دونوں محاذوں پر جاری ہے اور اسی نسبت سے حالات کو متاثر بھی کرتی ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی دیکھنا ہے کہ آنجہانی پنڈت جواہرلال نہرو کا یہ خیال کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ زخم مندمل ہو جائے گا، کہاں تک درست ثابت ہو رہا ہے۔

مسئلہ کشمیر پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں جو یوں تو بڑی حزم و احتیاط کی محتاج ہیں، مگر اس میں افسوسناک تشنگی یہ ہے کہ کوئی بھی ایک کتاب ایسا مواد فراہم نہیں کرتی جو اس مسئلہ کے اصل اسباب اور پس منظر میں کارفرما محرکات سے کماحقہ بحث کرتا ہو۔ ہماری حکومتوں کی بھی یہ بڑی کوتاہی اور غفلت رہی ہے کہ انہوں نے بھی اس طرف توجہ نہیں دی اور اگر مزید کچھ عرصہ اسی طرح گزر گیا تو درجہ اول کی اطلاعات رکھنے والے ارباب ہمت سب ہی خدا کو پیارے ہو چکے ہوں گے۔ پھر اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہو گا کہ پہلے

سے شائع شدہ مواد جو خود بھی پوری حقیقت کو واضح نہیں کرتا' اس پر مزید دوسرے بلکہ تیسرے اور چوتھے درجے کی اطلاعات پر اکتفا کرنا ہو گا۔ اس طرح اصل حقیقت پھر بھی محض افسانہ بن کر رہ جائے گی۔ اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ اس مسئلہ کے تاریخی پہلو اوجھل نہ ہونے پائیں۔

اس مسئلہ کا ایک نازک پہلو یہ ہے کہ اہل کشمیر و پاکستان کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہونا چاہئے کہ یہ مسئلہ پیدا کیسے ہوا یعنی یہ مسئلہ دراصل ہے کیا؟ اور اس طویل عرصہ میں اس مسئلہ پر کیا اچھے یا برے اثرات مرتب ہوئے ہیں اور مسئلہ کشمیر پر ہماری مخالف قوتوں نے کیا کیا ریشہ دوانیاں کی ہیں نیز یہ مسئلہ بالآخر کیسے حل کیا جاسکتا ہے اور مسئلہ کا حل ہے کیا؟ یہ وہ اہم پہلو ہے جس کا صحیح علم نہ ہونے کے باعث قومی صلاحیتیں بالعموم اور نوجوانوں کی صلاحیتیں بالخصوص اکارت جاسکتی ہیں۔ بلکہ اغلب یہ ہے کہ ایسی غلط فہمیاں پیدا ہوں جن سے اس کشمکش کا نتیجہ ہی باہمی تضاد اور صلاحیتوں کی مکمل بربادی کی صورت میں بر آمد ہو۔ یوں بھی کسی جنگ میں اپنے مقاصد کے تعیّن ان کے حصول کیلئے حکمت عملی ،قوت کے اجتماع اور استعمال کے تقاضوں کا ضروری اور لابدی علم ہونے کے علاوہ اس کی ایک ناگزیر ضرورت یہ بھی ہوتی ہے کہ دشمن کے مقاصد ان کے حصول کیلئے اس کی حکمت عملی اور قوت اور اس کے استعمال کی صلاحیت کا بھی کماحقہ علم ہو۔ جب تک کسی کے سامنے یہ پہلو نہیں ہوں گے' وہ کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔

اہل کشمیر تو بہرحال اس مسئلہ کا چونکہ خود ایک نشانہ ہیں' اس لئے اس کی کچھ نہ کچھ سمجھ تو ضرور رکھتے ہیں ،لیکن ملت پاکستان کے بوڑھے ہوں یا جوان پیشرو ہوں یا پیرو ،حکمران ہوں یا عوام الناس ،سبھی کیلئے اس کی تفہیم کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے یہ بھی کیا کم ستم ظریفی ہے کہ وہ غیور عوام و خواص جو ملت اسلامیہ پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں اور کشمیر کی آزادی کی تحریک میں شانہ بشانہ تھے' آج اس مسئلہ کے بارے میں سرے سے ہی ذہنی الجھن میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں یہ پراپیگنڈا کیا جاتا تھا کہ مسئلہ کشمیر صرف مغربی پاکستان والوں کا مسئلہ ہے اور اس کا حل انہی کے مفاد میں ہے اور اگر سندھ اور بلوچستان میں بھی یہ کہا جائے کہ یہ پنجاب اور سرحد کا مسئلہ ہے یا پنجاب اور سرحد میں یہ کہا جائے کہ یہ صرف کشمیریوں کا مسئلہ ہے ،کشمیری خود ہی کیوں نہیں لڑتے اور اسی نوعیت کی بیشمار دوسری باتیں زیر بحث آئیں اور اس پر ذمہ دار حضرات حکومت کے اندر اور باہر بالکل خاموش ہوں تو ظاہر ہے پھر سوچ کے غلط ہونے کا امکان ہی باقی رہتا ہے اور جب سوچ اور فکر کے زاویئے ہی غلط رخ پر ہو جائیں تو پھر عمل کیسے درست ہو سکتا ہے؟ اسوقت ہمارے ہاں صورت حال بالکل یہی ہے اور یہ اس انتہائی افسوس ناک ہے اس کا جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔

مسئلہ کشمیر خود پاکستان کیلئے جس قدر اہم ہے اور پاکستان کی سلامتی اور بقاء کے ساتھ اس کا جتنا گہرا تعلق ہے' افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ خود پاکستان کے اندر اسی نسبت سے اس مسئلہ سے واقفیت کم ہے۔ احساس تو شاید ہی کسی جگہ باقی رہا ہو میں عوامی رجحان کی بات نہیں کرتا وہ تو ہمیشہ سے ہی صحیح سمت پر رہا

ہے مگر ہماری نوجوان نسل ، حکمران ، سیاست دان اور دانشور تو اس مسئلہ کو ثانوی حیثیت بھی شاید نہیں دیتے ، بلکہ ایسی مختلف ، منقسم اور منتشر آراء رکھتے ہیں کہ ان کے باعث یہ مسئلہ ایک ایسا گورکھ دھندہ نظر آنے لگا ہے جس سے محض اکتاہٹ ہوتی ہے۔ یہ مسئلہ جس توجہ اور اہمیت کا مستحق ہے ، قومی سطح پر اسے اس کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں دکھائی دیتا بلکہ میں کافی عرصہ سے دیکھ رہا ہوں کہ اس مسئلہ کے حل کیلئے نیم دلی یا بددلی کے ساتھ بطور مجبوری ہماری قومی سطح سے افتاں و خیزاں جو بھی کوششیں ہوتی رہی ہیں ، مجھے ہمیشہ ایسا محسوس ہوا کہ اول تو وہ محض ردعمل کے طور پر کی گئیں ، ثانیاً وہ بھی کسی صحیح اور بامقصد منصوبہ بندی کے نہ ہونے کے باعث نتیجۃً یا تو محض تضیع اوقات ثابت ہوئیں یا پھر باہمی مناقشت کا سبب بنیں یا اس سے ذرا بڑھ کر ، بسا اوقات وہ خود دشمن کے ہی بچھائے ہوئے جال میں پھنسنے کا کام دیتی رہیں۔

ہر وہ شخص جو مسئلہ کشمیر کے بارے میں سوچتا ہے ، خواہ وہ کشمیر کا باشندہ ہو یا پاکستانی ہو یا پھر کسی بھی دوسری مملکت سے تعلق رکھتا ہو ، لامحالہ یہ سوال کرتا ہے کہ یہ مسئلہ آخر ہے کیا؟ اور اس کا حل کیا ہے اور کون اس کیلئے کیا کر رہا ہے ؟ ۔ اندرون ملک کئی آراء گشت کر رہی ہیں جو باہم متضاد اور بہت مختلف ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ مسئلہ کشمیر ہر دو مخالف و موافق معنی میں پاکستان کی بقاء اور سلامتی کا مسئلہ ہے۔ بعض نادانوں کے نزدیک مسئلہ کشمیر پاکستان کی معیشت پر ایک بوجھ ہے۔ بیرون ملک لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ اگر یہ آزادی کا مسئلہ ہے تو اس میں وہ گرمی کیوں نہیں جو دوسرے اس سے ملتے جلتے مسائل میں دکھائی دیتی ہے۔ پھر یہ کہ بیرون ملک تو خاص طور پر لیکن ملک کے اندر بھی یہ سمجھنا نہایت ہی مشکل ہو رہا ہے کہ یہ مسئلہ محض کسی مخصوص خطے کی آزادی کا نہیں بلکہ یہ "تحریک پاکستان" کا ایک حصہ ہے جو جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے حق خود ارادیت کی تحریک تھی۔ کئی لوگ تو بھارتی پراپیگنڈا سے متاثر ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ مسئلہ بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں کے مابین کوئی سرحدی تنازعہ ہے جس میں کسی دوسرے ملک کی مداخلت کی ضرورت نہیں ہے اور یہی دونوں ملک اس کو طے کرنے کے اصل مجاز ہیں۔ اس قسم کے کوئی درجن بھر خیالات اس مسئلہ سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ اس صورت حال سے جو لوگ سب سے زیادہ متاثر ہو رہے ہیں وہ کشمیری اور پاکستانی عوام ہیں۔ ان کے علاوہ ہمارے ہمدرد اور دوست ممالک کے لوگوں کو اس طرح متاثر کر کے ان میں غیر جانبدار رہنے کا رحجان کامیابی سے پیدا کیا جا رہا ہے۔ میں چونکہ اس مسئلہ پر ملک کے اندر اور باہر کافی عرصہ سے اور کئی سال سے مسلسل بات کرتا آیا ہوں اور اس میں ملّی مؤقف پیش کرتا رہا ہوں ، اس لئے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر ملک کے اکثر تعلیم یافتہ لوگوں خصوصاً زیر تعلیم نوجوانوں کے ساتھ اکثر بحث ہوتی رہتی ہے۔ وہ وہاں کئی قسم کی تحریکوں سے متاثر ہوتے ہیں ۔ ان تمام بحثوں ، ان کے دلائل اور تجسّس و سوالات کے پیش نظر ضرورت سمجھی گئی کہ اس پوری بحث کو حتی الامکان یکجا کر دیا جائے ، شاید اس سے مفید نتائج بر آمد ہو سکیں اور اس ضمن میں ذہنی انتشار کو دور کر کے ایک فکری اور نظریاتی نظم و ضبط اور ہم آہنگی پیدا کی جا سکے جو کسی بھی کام کی کامیابی کیلئے اصل اصول ہے۔

اس میں میری کوشش یہ ہے کہ محض ایک نظریہ کے تحفظ کی خاطر دور کی کوڑی نہ لائی جائے بلکہ اس کے خلاف اور حق میں قابل عمل اور ان کے مثبت اور منفی اثرات کی بنیاد پر بات کی جائے تاکہ جو شخص دیانت داری سے بات سمجھنا چاہے' اس کی معاونت ہو سکے اور جو نہ سمجھنا چاہے تو اس کا معاملہ ہمارے دائرۂ کار سے باہر ہے۔ بھلا خود کشی کرنے والے کو کیسے اور کب روکا جاسکتا ہے؟ اسی طرح نہ تو بعض بین الاقوامی امراض کو روکا جاسکتا ہے اور نہ فیشن پرستی کے زہر کا ہی کوئی فوری تریاق موجود ہے۔ اسوقت صورت یہ ہے کہ کچھ لوگ اس مسئلہ کو محض غیر جانبدارانہ طریقہ سے دیکھتے ہیں' کچھ بھارتی پراپیگنڈا کے نقطۂ نظر سے اس کا اندازہ کرتے ہیں اور کچھ لوگ بعض بڑی طاقتوں کے مفادات کے نقطۂ نگاہ سے اس کا جائزہ لیتے ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا ہے کہ اس مسئلہ کو نہ تو کشمیریوں کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جارہا ہے نہ پاکستانی ملّت کے نقطہ نظر سے۔ اس میں بدنصیبی یہ ہے کہ دونوں موخرالذکر فریق اس میں روز بروز پسپا ہوتے جا رہے ہیں۔ ان دونوں کے کئی اقدامات ایسے ہیں جو اس پسپائی کی علامت ہیں۔

کشمیر کے مسئلہ پر زیر نظر تحریر کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اس کی حقیقی ضرورت کے تناسب سے ہی لگایا جاسکے گا۔ بین الاقوامی طور پر اس پورے مسئلے کی جو بھی اہمیت ہو مگر پاکستان اور خود اہل کشمیر کیلئے اس سے بڑا کوئی دوسرا مسئلہ نہیں جس کی بہترین نشاندہی خود بانیٔ پاکستان قائداعظمؒ نے نہایت ہی مناسب اور محققانہ انداز میں ان الفاظ میں کی تھی کہ "کشمیر کا مسئلہ نہایت ہی نازک مسئلہ ہے" لیکن اس حقیقت کو کوئی انصاف پسند قوم اور ملک نظرانداز نہیں کر سکتا کہ کشمیر تمدنی' مذہبی' جغرافیائی' معاشرتی' دفاعی اور سیاسی طور پر پاکستان کا حصہ ہے۔ جب بھی اور جس نقطۂ نظر سے بھی کشمیر کے نقشہ پر نظر ڈالی جائے گی تو یہ حقیقت واضح ہوتی جائے گی کہ کشمیر سیاسی اور دفاعی لحاظ سے پاکستان کی شہ رگ ہے اور کوئی ملک اور قوم برداشت نہیں کر سکتی کہ اپنی شہ رگ کو دشمن کی تلوار کے نیچے دے دے۔ کشمیر پاکستان کا ایک ایسا حصہ ہے جسے پاکستان سے الگ نہیں کیا جاسکتا" قائداعظمؒ کے ان الفاظ کے اگر کوئی معانی ہیں' تو پھر ظاہر ہے کہ ملت پاکستان سے تعلق رکھنے والے حضرات کیلئے مسئلہ کشمیر کی بنیاد اسی پر رکھی جائے گی اور تمام خیالات اور آراء کو اسی معیار پر پرکھا جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ کشمیر کے مسئلہ پر اس وقت تک جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ قائداعظمؒ کی بیان کردہ اس بنیاد سے نہ صرف دور ہے بلکہ ان کا رخ مخالف سمت میں دکھائی دیتا ہے۔

برّصغیر پاک وہند کو جس مسئلہ نے مستقل کشیدگی کے ذریعہ ایک آتش فشاں کے دہانے پر لا کھڑا کر دیا ہے' وہ مسئلہ کشمیر ہی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ آتش فشاں ایسا ہے کہ اس کے پھٹنے سے بھارت اور پاکستان کے درمیان محض دو فوجوں کی نہیں بلکہ دو قوموں کی انتہائی تباہ کن جنگ ہو سکتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ بڑی طاقتوں کی مداخلت سے یہ پورے عالم کو ہی اپنی لپیٹ میں لے لے۔ لیکن کیا عجیب اتفاق ہے کہ ایسی سنگین نوعیت کے اس مسئلہ کے اصل خدوخال ہی ہماری نظروں

سے اوجھل ہو رہے ہیں بلکہ دوسری جانب بھارت اور اس کے ہمنواؤں کے پراپیگنڈے کے زور آور اثر سے نت نئ صورت حال پیدا ہو رہی ہے اور وہی منصوعی صورت ہے جو بالعموم آسانی سے دکھائی دیتی ہے یعنی کشمیر کے بارے میں جو تصویر بھارت ہمیں دکھانا چاہتا ہے، ہم اس کو ہی درست ماننے پر مجبور ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس میں صرف بھارت کا ہی کمال نہیں ہے بلکہ ہماری اپنی کوتاہیوں غفلتوں اور نااہلیوں کا بھی بے حد دخل ہے۔ وہ مسئلہ جس پر لاکھوں فرزندان توحید نے جانیں نثار کیں اور لگ بھگ نصف صدی سے ایک انتھک جدوجہد میں مصروف ہیں اور جو مسئلہ دو پڑوسی ملکوں کی معیشت اور سیاست پر ہر وقت سیاہ بادل کی طرح چھایا رہتا ہے، اس کی اگر اصل صورت ہی نظر نہ آسکے تو یہ کتنی بڑی تاریخی ستم ظریفی ہو گی، خصوصیت کے ساتھ وہ فریق جس کے لئے یہ مسئلہ موت و حیات کا مسئلہ ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ نہ صرف اسے خود یہ مسئلہ اچھی طرح معلوم ہو بلکہ اسے اس قابل ہونا چاہئے کہ دوسروں کو اچھی طرح سمجھا سکے، لیکن اگر وہی فریق یعنی کشمیری اور پاکستانی عوام خود ہی اس سے نابلد ہو جائیں اور بے یقینی کا شکار ہوں تو پھر وہ دوسروں کو کیا سمجھائیں گے اور مخالفین کی کارستانیوں سے کیسے عہدہ براہوں گے۔ یہ کام تو روز اول سے کرنے کا تھا مگر بدقسمتی سے یہ ایک ایسا تاریخی سانحہ ہے جس کا ماتم ہی کیا جاسکتا ہے اس پر سرے سے کوئی توجہ نہیں دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اولاً تو ہم خود ہی اس سے بیگانہ ہوتے چلے گئے بلکہ ملک کے اندر اس مسئلے کی تفہیم پر ہماری کمزوری، وقت، حالات اور دشمن کے پراپیگنڈا کی گرد تہ در تہ جم گئی ہے جس کا بھرپور فائدہ اٹھا کر دشمن ہمیں مسلسل پیچھے دھکیلتا چلا گیا۔ کشمیریوں کا بھی کم و بیش یہی حشر ہوا۔ سوائے اس کے کہ آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس نے جو اس تحریک کی خالق جماعت ہے، انتہائی نامساعد حالات میں بھی اس علم کو سرنگوں نہ ہونے دیا مگر بد نصیبی سے بیشتر کوششیں ایک اندرونی خرابی کے باعث اپنے ہی گھر میں باہمی تضادات پر صرف ہو کر رہ گئیں۔ پھر اس طرح جو خلا پیدا ہوا وہ "خانۂ خالی را دیواں گیرند" کے مصداق تخریبی اور منفی کارروائیوں سے پر ہونا شروع ہوا جن میں کچھ تو یقیناً دشمن کی پیدا کی ہوئی ہوں گی اور کچھ کی وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ حمایت اور حوصلہ افزائی کر رہا ہو گا اور کچھ سے وہ بہتر طور پر استفادہ کرے گا۔ چنانچہ آج جہاں ہم کھڑے ہیں وہ صورت یہ ہے کہ ہماری وہ نسل جس نے آزادی حاصل کی تھی، اس کے بااثر، متحرک اور فعال کارکن کچھ تو ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں اور کچھ ذاتی مشغولیت کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں اور بعض مایوس ہو کر اور بددل ہو کر اپنی افادیت کھو چکے ہیں۔ رہی جواں سال نسل، تو وہ نہ صرف ماضی سے بے خبر ہے بلکہ سیاسی عمل کے فقدان کے باعث اس کو چونکہ بامقصد، نظریاتی تربیت اور تاریخی واقفیت سے بے بہرہ رکھا گیا، اس لئے وہ بھی منفی فلسفیانہ رجحانات اور فیشن سے ہی متاثر ہو رہے ہیں اور ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی ہے جو صرف دشمن کے عزائم کی تکمیل کیلئے تو راہ ہموار کر سکتی ہے لیکن ہمارے اصل اور قومی مقاصد کے حوالے سے تقریباً بیکار ہے سوائے اس کے کہ ہم پھر سے

لوٹ کر اصل کی طرف آ جائیں اور ظاہر ہے کہ یہ کام ہرگز آسان نہیں ہے۔ تاہم میرا تجربہ یہ ہے کہ آتش کا شرارہ تو موجود ہے بشرطیکہ اسے بھڑکا یا جا سکے۔

ع ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی"

یہاں ایک مثال برمحل ہوگی وہ یہ کہ سال ۷۰۔ ۱۹۶۹ء میں مجھے آزاد کشمیر کی انتخابی مہم کے دوران ملک بھر میں تقریباً ہر طبقہ زندگی کے ساتھ بات کرنا پڑی۔ بعض مقامات پر وکلاء حضرات سے بار روم میں بات ہوئی تو کئی ایک نے مجھ سے وہی سوال کیا کہ کشمیر اگر "خود مختار" ہو جائے تو اس میں کیا خرابی ہے؟ میں نے جواباً جب وضاحت کی تو وہ وکلاء صاحبان پریشان ہو گئے اور کہنے لگے کہ "بھائی کہیں ہمیں بھی ملک دشمن نہ سمجھ لینا" ہم نے تو اس مرتبہ پہلی بار یہ مسئلہ آپ کی زبان سے سمجھا ہے۔ یہ تجربہ کسی ایک جگہ یا ایک طبقہ کے ساتھ نہیں ہوا بلکہ مختلف مقامات پر اور مختلف الخیال طبقوں سے بار بار ہوتا رہا۔ ماضی میں ایک مرتبہ اندرون پنجاب ایک بار روم میں یہی سوال کیا گیا۔ ۱۹۷۱ء میں مجھے صدر بننے کے بعد وزارت خارجہ کے ساتھ وزیراعظم پاکستان کے حکم سے اچھی خاصی مشق کرنا پڑی تھی، ورنہ وزارت خارجہ کا ایک عنصر بھی بدقسمتی سے "خود مختار کشمیر" کے نعرہ سے متاثر تھا۔ ۱۹۴۸ء میں جب میں فرمانروائے سعودی عرب شاہ فیصل مرحوم سے ملا تو انہوں نے بھی پہلے پہل یہی کہا کہ کشمیر اگر خود مختار ہو جائے تو کیا حرج ہے؟ لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ اپنی خداداد ذہانت اور ملت اسلامیہ کے اتحاد کے درد کے باعث مختصر وقت میں پوری بات سمجھ گئے۔ اس کا ذکر قدرے تفصیل کے ساتھ میری کتاب "کشمیر بنے گا پاکستان" میں ہے۔ ۱۹۵۶ء میں جب میں صدر تھا تو برطانوی پارلیمان کے دو ممبر جو آزاد کشمیر آئے تھے، انہوں نے بھی نشاندہی کی کہ یہاں خود مختاری کے نام پر جو تحریک چل رہی ہے، وہ اس ملک اور اس کے مقاصد کے خلاف ہے۔ مختصر یہ کہ ایک طرف تو وہ سواد اعظم ہے، جو اپنے مقصد سے بے خبر اور بے نیاز اور دوسری طرف وہ چند لوگ ہیں، جو منفی اور تخریبی نظریات اور رجحانات کی ترویج اور اشاعت کیلئے ایک انتقامی جذبہ کے ساتھ مصروف عمل ہیں۔ ایک طرف ہماری مرکزی حکومت اس ضمن میں کوئی رہنمائی مہیا نہیں کر رہی جبکہ دوسری طرف ایک بدنصیبی یہ ہے کہ تخریبی اور منفی رجحانات والے مفاد پرست عناصر نے ہماری انتظامیہ میں کافی لوگوں کو متاثر کر کے ان کی پشت پناہی نہیں بلکہ بھرپور حمایت حاصل کی ہوئی ہے۔ وہ ان مخالفین کو ہی جو علیحدگی پسندی کے منفی اور تخریبی نظریات کے کھلم کھلا علمبردار ہیں، اپنی تمام تر نوازشات کا مستحق قرار دیتے ہیں اور جو باقی ہیں وہ دوسرے معاملات کی طرح اس میں بھی غیر جانبداری کا معذرت خواہانہ رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ بعض سرکاری ملازم ہم ہی لوگوں کو (جو الحاق پاکستان کی تحریک چلا رہے ہیں) غیر محب وطن بلکہ دشمن سمجھتے ہیں۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم کو بھی اسی طرح متاثر کر دیا گیا تھا اور اسی وجہ سے ہم ان کے عتاب کا نشانہ بنے رہے اور وہ تاریخی سانحہ بھی اسی دور میں ہوا کہ رئیس الاحرار چودھری غلام عباس مرحوم کو بھی

حکومت آزاد کشمیر نے نا اہل قرار دیا۔ وہ چودھری غلام عباس جو ریاست جموں و کشمیر کے مسلمانوں کے مسلمہ نمائندے اور تحریک تکمیل پاکستان کے بانی اور اس کا مظہر اور علامت تھے، جن کا دامن پروردگار نے ہر آلائش سے پاک رکھا تھا اور جو اپنے سیاسی قدو قامت میں قائداعظمؒ کے بعد دوسرے درجے پر تھے۔ بلکہ خود قائداعظمؒ نے ایک ثقہ اور معروف روایت کے مطابق جن دو اشخاص کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا، ان میں سے ایک نواب بہادر یار جنگ تھے اور دوسرے چودھری غلام عباس مرحوم تھے جن کی رائے قائداعظمؒ اپنے اکثر ساتھیوں کی آراء پر مقدم جانتے تھے۔ الغرض اس وقت یہ سمجھنا ضروری ہے کہ

(الف) ۔ کشمیر کی آزادی کی جو تحریک چل رہی ہے وہ دراصل ہے کیا؟ اور کب سے چلی اور کس نے چلائی؟ مقاصد کیا تھے؟ اور اس کیلئے کیا کیا قربانیاں دی گئیں؟ اور اس وقت کیا ہو رہا ہے؟ مشکلات کیا ہیں؟ کون پیدا کر رہا ہے؟ اور اس کا حل کیا ہے؟۔

(ب) ۔ خود کشمیری عوام کیا چاہتے تھے؟ اور اب کیا چاہتے ہیں؟۔

(ج) ۔ اس تحریک کے خلاف دوسری کون سی تحریکیں اٹھی ہیں اور ان کا پس منظر اور تاریخ کیا ہے؟ مقاصد کیا ہیں اور طریقۂ کار کیا ہیں؟ اور کون ان کی پشت پناہی کرتا ہے؟ بھارت کا (جو پاکستان کی کھلی دشمن طاقت ہے) اس میں کوئی ہاتھ ہے یا نہیں؟۔

(د) ۔ اس صورت حال میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

ان امور کی تفصیل تو طوالت طلب ہے تاہم نہایت ضروری ہے کہ اس کی ضروری اور مناسب وضاحت کر دی جائے تاکہ ہم اپنے لئے ایک رخ متعین کر سکیں، نہ یہ کہ ایک آوارۂ منزل قافلہ کی طرح ہر آواز پر کان کھڑے کر لیتے ہوں اور بدستور بھٹکتے رہیں۔ اس پورے معاملے کو صرف ایک نظریہ اور عقیدہ کے تقدس کی بنیاد پر ہی نہیں بلکہ واقعات، حقائق اور تاریخی عمل کے نقطۂ نظر سے بھی واضح کرنا ضروری ہے۔ یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ آیا جو حل پیش کئے جاتے ہیں، وہ کسی اعتبار سے قابل عمل بھی ہیں یا نہیں اور ان کا فوری نقصان یا فائدہ کیا ہے؟۔ اور کیا ان کو اختیار کرنے سے یہ مسئلہ فی الواقع حل ہو جائے گا۔

پاک بھارت تعلقات۔۔۔ ماضی، حال، مستقبل

جب سے برِّ صغیر ایشیا آزاد ہوا ہے اور پاکستان دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا ہے، مسلسل یہی شور سن رہے ہیں کہ پاک بھارت تعلقات کی بہتری میں ہی دونوں ملکوں کا مفاد پنہاں ہے اور اس میں کوئی اچنبھے

کی بات بھی نہیں ، کیونکہ اس برصغیر میں پائیدار امن کا راز فی الواقع ان ہی دو پڑوسی ملکوں کی دوستی اور ان کے مابین بہتر تعلقات میں ہی مضمر ہے۔ یہ بات بھی بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اگر ان دو ملکوں کے درمیان باعزت اور پائیدار امن کی خاطر کوئی مستقل سمجھوتہ ہو جائے تو یہ دونوں ملک جو دنیا کے اہم اور گنجان آباد علاقہ پر مشتمل ہیں ، نہ صرف اس پورے ایشیائی خطہ میں ، بلکہ دنیا بھر کے امن وامان میں نمایاں کردار ادا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ اور عجب نہیں کہ یہی حسن وخوبی وبال جان بن گئی ہو۔ اسی طرح ہم اس نصف صدی میں آئے دن یہ بھی سنتے رہتے ہیں کہ پاکستان کو بھارت سے خطرہ ہے اور بھارت کو پاکستان سے خطرہ ہے۔ بلکہ آج کل تو ہماری حکومت کھلے واقعات پر پردہ ڈالنے کی فکر میں رہتی ہے اور بار بار کہہ دیتی ہے کہ پاکستان کو بھارت سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ جبکہ شومئ قسمت سے عین اسی وقت بھارتی لیڈر کہہ دیتے ہیں بلکہ شور مچا لیتے ہیں کہ بھارت کو پاکستان سے خطرہ ہے اور پاکستان بھارت کے خلاف جنگی تیاریاں کر رہا ہے یعنی یہ تیاریاں تو خود پاکستان میں کسی کو دکھائی نہیں دیتیں ، صرف دلی میں بھارتی لیڈروں کو خواب میں نظر آتی ہیں۔ تو آخر حقائق اور واقعات وشواہد کی رو سے یہ بھی تو معلوم ہونا چاہئے کہ اس خطرہ کے بارے میں فریقین کے مؤقف کی اصل کیا ہے اور کوئی فی الواقع کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے ؟

بہرحال ان دونوں ملکوں کے تعلقات کو معمول پر لانے اور برّصغیر میں امن واستحکام کے قیام اور بقاء کی خاطر اس برّصغیر کے اندر اور باہر متعدد بار کوششیں کی گئیں اور ہو رہی ہیں۔ کبھی تجارتی تعلقات کی بحالی ، کبھی مشترکہ دفاع کی پیشکش ، کبھی عدم جارحیت کا منصوبہ ، کبھی دوستی اور تعاون کا معاہدہ سیاسی اور سفارتی سطح پر موضوع بحث اور زیر غور رہا ہے لیکن آج تک کوئی کوشش بار آور ثابت نہیں ہوئی اور یہ تمام محنت ضائع ہو گئی۔ ڈپلومیسی کے میدان میں جو کھیل کھیلا گیا اور جو نظارے نظر آ رہے ہیں یاد کھائے جا رہے ہیں تو گویا ان کی بنیاد اسی تار عنکبوت پر ہے اور یہ سب کچھ فریب نظر کے سوا کچھ نہیں۔ ہر فریق کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ان تعلقات ، معاہدوں اور وعدوں کی اصل حقیقت کیا ہے ؟ یہ بھی محلِّ نظر ہے کہ ان کوششوں میں سنجیدگی ہے کس قدر ، بلکہ ہے بھی یا نہیں ؟

اب تک تو ان تعلقات کی بہتری اور بحالی کیلئے بظاہر جو بھی پیش رفت ہوتی رہی ہے وہ اولاً تو یکطرفہ تھی یعنی صرف پاکستان کی جانب سے ہی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس کا ایک محرک دونوں ملکوں سے باہر کا دباؤ بھی تھا یعنی کسی ایک یا دوسری سپر پاور کی خواہش یا ضرورت کی تعمیل اور تکمیل کی خاطر "دلی" اور "اسلام آباد" کے باہمی تعلقات میں کبھی ٹھہراؤ اور کبھی ارتعاش پیدا ہوتا رہا۔ جہاں تک بڑی طاقتوں کا تعلق ہے ان کا اپنا طویل المدت مفاد شاید اسی میں ہے کہ پاکستان اور بھارت جو کئی قسم کے تاریخی رشتوں میں منسلک ہیں اور جو لامحدود وسائل کے مالک ہیں از خود آپس میں کوئی سمجھوتہ نہ کر لیں تاکہ یہ اپنی مرضی سے عالمی سیاست میں اپنا کوئی کردار ادا کرنے کے قابل نہ ہوں اور بعید از قیاس نہیں کہ شاید بعض طاقتیں

بھارت کے ساتھ اس پر بھی متفق ہوں کہ اسلام کے نام پر قائم ہونے والی یہ ریاست کہیں مستقل اور دائمی نہ ہو جائے۔ اس حقیقت سے بھی انکار ناممکن ہے کہ ان دونوں ملکوں یعنی پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات کی بہتری کیلئے بھارت کی طرف سے کبھی بھی کسی حقیقی خواہش اور کوشش کا اظہار نہیں کیا گیا جس کا مقصد دنیا کے اس حصہ میں پائیدار امن کا قیام اور تنازعات کا منصفانہ اور باعزت تصفیہ ہو بلکہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں یہ خواہش اور کوشش صرف پاکستان کی جانب سے ہی رہی ہے، بھارتی حکومت نے کبھی بھی کسی مرحلہ پر سچے دل سے پاکستان کی طرف دست تعاون نہیں بڑھایا بلکہ اس کے برعکس دیدہ و دانستہ ایسا طرز عمل اختیار کر رکھا ہے جس نے پاکستان کی طرف سے کی گئی تمام مثبت کوششوں اور نیک خواہشات کو ناکام بنا دیا اور اس طرح دو طرفہ تعلقات کا سارا عمل عملاً سبوتاژ ہوتا رہا۔ ایسی تمام یکطرفہ ناتمام اور ناپائیدار کوششوں کا جو منطقی نتیجہ ہونا چاہئے تھا وہی ہوا۔ یعنی کبھی ہم دو چار قدم آگے چلے تو چھ قدم پیچھے آ گئے اور سابقہ شکوک و شبہات کو مزید تقویت ملی اور باہمی تلخیوں میں اضافہ ہوا یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ پاک بھارت تعلقات کی اصلاح کے بارے میں بھارت کے اندر اتنا چرچا نہیں ہے جتنا ہمارے ہاں ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں نہ صرف حکمرانوں کی ہی یہ بڑی خواہش معلوم ہوتی ہے کہ باہمی تعلقات بہرحال سدھر جائیں بلکہ بعض عوامی حلقوں کی طرف سے بھی بارہا یکطرفہ "دوستانہ جذبات" کا اظہار کیا جاتا رہا جس کی حدیں بسا اوقات بزدلی اور بے حمیتی سے جا ملتی ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ یہ مملکت خداداد جن عظیم قربانیوں کا ثمر ہے، پاکستان میں بسنے والوں کی اکثریت کو ان قربانیوں کے بغیر ہی یہ نعمت ملی اور انہیں یہ نہیں معلوم کہ یہ ملک کیسے بنا اور اس کو پایندہ تر اور تابندہ تر بنانے کے تقاضے کیا ہیں؟ یا وہ لوگ، جنہیں پاکستان کا بننا ناگوار تھا انہوں نے ابھی تک اسے قبول نہیں کیا رفتہ رفتہ طاقتور ہو رہے ہیں اور سازشوں میں بدستور مصروف ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر ہم نے پروردگار کی اس نعمت غیر مترقبہ یعنی پاکستان کی بے قدری اور ناشکری اسی طرح جاری رکھی تو کہیں خدانخواستہ ہم سب " ولئن کفرتم ان عذابی لشدید " "ترجمہ۔ اور اگر تم نے ہماری نعمتوں کی ناشکری کی تو بیشک میرا عذاب بہت سخت ہے" کے مستحق نہ ٹھہریں۔ جس کا ایک المناک منظر "سقوط ڈھاکہ" کی صورت میں ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں جس نے ہماری پوری تاریخ کو داغدار کر دیا۔ الامان والحفیظ باللہ۔

یہ امر اور بھی افسوسناک ہے کہ پاکستان بنانے والے اصل لوگ جو اپنا سب کچھ لٹا کر اس نئی مملکت خداداد میں آئے تھے وہ بھی بوجوہ اتنے مایوس نظر آ رہے ہیں کہ ان میں بھی اب وہ پہلا سا جوش و خروش اور شوق و ولولہ باقی نہیں رہا جس نے انہیں اتنی بڑی قربانیوں کیلئے آمادہ کیا تھا جس کی مثال تاریخ عالم میں ملنی محال ہے۔ ہمارے وطن عزیز کے سیاست دانوں میں بھی "پس چہ باید کرد" یعنی "پھر کیا کیا جائے" کے سوال پر مختلف اور متضاد آراء پائی جاتی ہیں جو بدقسمتی سے ایک حد پر پہنچ کر بنیادی سیاسی اختلاف کی شکل اختیار کر لیتی ہیں بلکہ بعض تو خود ملک کی سلامتی و بقاء اور اس کے تقدس سے ہی متصادم

ہونے لگتی ہیں۔ اس کے برعکس بھارت میں جہاں مختلف نسلی، مذہبی، ثقافتی اور سماجی گروہوں کے درمیان تاریخی طور پر شدید اندرونی تصادم کے پیش نظر یہ اختلاف نمایاں ہونا چاہئے تھا، وہاں تو یہ اس مقدار میں نظر نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ بھارتی حکمرانوں، سیاست دانوں، دانشوروں اور بیورو کریسی میں خواہ وہ کسی بھی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہوں، پاکستان کی مخالفت کے سوال پر اکثر وبیشتر باہم کامل اتفاق رائے رہا ہے۔ اگر ان کے درمیان اس مسئلہ پر کبھی اختلاف رائے پایا بھی گیا، تب بھی وہ محض فنی نوعیت کا تھا، حقیقی نہیں تھا۔ اور نہ اس سے پاکستان کو کبھی بھی کوئی فائدہ پہنچا۔ سیاسی سوچ کی یہ بے راہ روی اور تخریبی افکار کی "مادر پدر آزادی" گویا صرف ہمارے حصہ میں آئی ہے۔ دنیا کے کسی دوسرے ملک کے باشندوں کو یہ آزادی حاصل نہیں۔ اور خدا کسی باغیرت قوم یا ملک کو اس قسم کی تباہ کن آزادی نصیب نہ کرے۔

ستم بالائے ستم یہ کہ ہمارے بعض "اہل الرائے" اور "اہل دانش" حضرات کا اصرار تو یہ ہے کہ ان کی یہ "سوچ" ہر حال میں بہتر ہے، خواہ یہ سوچ اس مملکت کی بنیادوں سے ہی متصادم کیوں نہ ہو۔ ایسی سنگین صورت حال میں اس ملک کے محب وطن عوام و خواص (جن کی اس ملک میں بڑی بھاری اکثریت ہے) کیلئے مشکل ہے کہ وہ خود بخود کسی بامقصد راستہ پر پہنچیں یا کوئی واضح سمت متعین کر سکیں۔ اور جن کا یہ فرض اولین تھا کہ وہ رہنمائی کریں، انہوں نے تو بانئ پاکستان حضرت قائداعظمؒ کی وفات کے بعد پالیسی بناتے وقت ان بنیادی تقاضوں کو ہی سرے سے فراموش کر دیا۔ عوام تو درکنار، کبھی خواص کو بھی اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ اگر میں یہ کہوں تو بیجا نہ ہو گا کہ ہماری حکومتوں نے بھارت کے ساتھ تعلقات کے بنیادی تقاضوں کو سرے سے سمجھا ہی نہیں یا ان کو یکسر نظرانداز کر دیا اور اسے عارضی، فروعی اور جزوی مفاد اور امور تک محدود رکھنے کی کوشش کی۔ ورنہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے ہاں ہمارے ارباب اقتدار اپنی ذہنی اور فکری استعداد اور صلاحیتوں سے محروم ہو چکے ہیں چونکہ نبیؐ کا ارشاد غلط نہیں کہ لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ (ہر بیماری کا علاج ہے) یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ سوائے چند سرکاری ملازمین کے جو ہر دور کے "عقل کل" ہوتے ہیں یہاں کسی کو بھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ حکومت نے کسی خاص قومی مسئلہ پر ایک خاص طرز عمل کیوں اختیار کیا ہے؟ بدقسمتی کی انتہا یہ ہے کہ ہر دور میں حکومتوں کی یہ کوشش رہی ہے کہ ملک کے عوام کو جو اس ملک کے اصل مالک ہیں، کسی صورت بھی کہیں یہ پتہ نہ چلنے پائے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اس گروہ کا جو اس قسم کی افسوسناک صورت حال کا ذمہ دار ہے گویا قومی امور میں ہمارا طرز عمل یہ ہے کہ اپنوں سے پردہ داری اور غیروں سے شناسائی۔ کیا اس حقیقت سے کوئی انکار کر سکتا ہے کہ تمام ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اپنے سادہ اور مخلص عوام کو ان معاملات میں غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں اور کبھی بھی ان کو صحیح صورت حال سے باخبر نہیں کیا گیا۔ اس اصول سے انکار نہیں ہے کہ سیاست عالم میں یقیناً کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جن پر عمل تو کیا جاتا ہے مگر ان کو بیان نہیں کیا جاتا۔

ان معاملات کی حدیں بہت تنگ اور محدود ہوتی ہیں مگر ہمارے ہاں تو ہمارے ہر معاملے کا یہی حال ہو رہا ہے۔ بری سے بری اور مہلک سے مہلک پالیسیوں کو بھی خوش آئند مستقبل کے سہانے خوابوں کی طرح پیش کیا گیا اور ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت عوام الناس کو سبز باغ دکھائے گئے۔ اس کی وجہ اگر بالفرض یہ ہو کہ بھارت کے اس جھوٹے لیکن مؤثر پروپیگنڈا کا کہ ''اسے پاکستان سے خطرہ ہے'' توڑ کیا جانا مقصود ہے تو اس کے اور بھی کئی توڑ ہو سکتے ہیں۔ اس کو اخفاء میں رکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس کیلئے ایک ایسی صحیح اور بامقصد حکمت عملی اپنانے کی ضرورت ہے جس کی بنیاد ملک وملت اور دین سے غیر مشروط اور پرخلوص وفاداری ہونا چاہئے مگر ہمارے سرکاری ادارے اور نشریاتی مراکز اس حال میں ہیں کہ ان ذرائع کا پروپیگنڈا اور نشریات سن کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے خدانخواستہ پاکستان بھارت کی کوئی نو آبادی ہے۔

قبل اس کے کہ پاک بھارت تعلقات کی اصل خرابی اور اس کے علاج کے بارے میں کچھ کہا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دو پڑوسی ملکوں کی جانب سے ماضی میں کی گئی ''اصلاح احوال'' کی ان کوششوں کا بھی سرسری جائزہ لیا جائے جو اس ضمن میں ہوتی رہی ہیں تاکہ اس تجزیہ سے اصل بات کی تہ تک رسائی حاصل کی جائے اور آئندہ کیلئے بھی اصل خرابی کی جڑ تک پہنچنے میں مدد ملے۔ آیئے اپنے گھر کی بات سے شروع کرتے ہیں۔ ہماری جانب سے ان تعلقات کی بہتری کی کوششوں کی ابتداء غالباً بھارت کے اس سرکاری دورے سے ہوتی ہے جس کا پاکستان کے پہلے وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خان مرحوم کو ۱۹۵۰ء میں موقع ملا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ تقسیم ہند کے برے اثرات وباقیات ابھی عیاں تھے مگر جو بات قابل ذکر ہے وہ یہ کہ دونوں وزرائے اعظم (پنڈت جواہر لال نہرو اور لیاقت علی خان مرحوم) کے درمیان مذاکرات کی میز پر باہمی تعلقات کی بحالی کا مسئلہ جب ڈپلومیسی کے لطیف پیرایوں اور اصطلاحوں میں الجھ گیا اور موضوع بحث واضح نہ ہو رہا تھا تو کہتے ہیں کہ بھارت کے متعصب ترین وزیر داخلہ سردار پٹیل نے جو اس موقع پر موجود تھے مسلسل خاموشی کے بعد لیاقت علی خان سے پوچھا ''کہ کیا آپ واقعی اصلاح احوال چاہتے ہیں یعنی آپ بھارت میں مسلمانوں کا قتل عام بند کروانا چاہتے ہیں'' ظاہر ہے کہ لیاقت علی خان مرحوم کا جواب اور کیا ہو سکتا تھا کیونکہ وہ گئے ہی اس مقصد کی خاطر تھے کہ اس دورہ کا کوئی مثبت نتیجہ نکلے۔ تو سردار پٹیل نے لیاقت علی خان کی طرف اشارہ کر کے اپنا یہ مشہور فقرہ کہا ''آپ وہاں (فرقہ وارانہ فسادات) بند کر دیں' میں یہاں بند کر دوں گا''۔ غالباً یہ ہندوستان کی سرزمین پر اعلیٰ سطح کی پہلی باقاعدہ کانفرنس تھی جس کی رو سے ۱۹۵۰ء کا ''لیاقت نہرو' معاہدہ ہوا اور دونوں مملکتوں میں اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں ایک مکمل سمجھوتہ طے پایا۔ یعنی اسوقت بھی تعلقات کی بحالی کیلئے اقلیتوں کے تحفظ کا مسئلہ بنیادی تھا۔ چنانچہ لیاقت علی خان مرحوم نے پاکستان آکر اپنا وعدہ اس طرح نبھایا اور اپنا فریضہ اس طرح ادا کیا کہ اب نصف صدی ہونے کو ہے مگر پاکستان میں کسی مسلمان کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ کسی ہندو پر انگلی اٹھا سکے اور نہ کسی ہندو کی نکسیر تک پھوٹی۔ اور یہی ہونا بھی چاہئے تھا' کیونکہ ہمارا دین اقلیتوں کے ساتھ



نواب زادہ لیاقت علی خان

فیاضانہ سلوک کا حکم دیتا ہے اور اقلیتوں کی جان ومال ، عزت و آبرو کو وہی تحفظ دیتا ہے جو اکثریت کو حاصل ہو۔

مگر تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ کیجئے۔ نہرو لیاقت معاہدے کے بعد بھارت میں کیا ہوتا رہا۔ وہاں تو اس کی سیاہی خشک ہونے کا بھی انتظار نہیں کیا گیا۔ اس نصف صدی میں شاید ہی ایسا کوئی مہینہ یا سال گزرا ہے کہ بھارت کے کسی نہ کسی حصے میں نہتے اور بے گناہ مسلمانوں پر حملے نہ ہوئے ہوں اور ناحق ان کا خون نہ بہایا گیا ہو۔ پھر جس ڈھٹائی اور بے حیائی کے ساتھ بھارت کی حکومت اس انسانیت سوز کارروائی پر چشم پوشی کرتی ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ سرکاری سطح پر ان انسانیت سوز فسادات اور مظالم کی حوصلہ افزائی ہوتی رہی ہے ، بھارتی حکومت نے کسی وقت بھی ان مظالم کو بند کرنے کی کوئی قابل ذکر کوشش ہی نہیں کی۔ بھارتی مسلمانوں کی حالت زار پر جو تبصرہ بھارت کے مشہور قوم پرست دانشور کے۔ ایل۔ گابا نے اپنی مشہور تصنیف ""مجبور آوازیں"" نامی کتاب میں کیا ہے، وہ ان عقل کے اندھے لوگوں کی آنکھیں کھولنے کیلئے کافی ہے جو ابھی تک کانگریسی نیشنلزم کے دام فریب کے اسیر ہیں۔ اور یہاں بھی نیشنلزم کی باتیں کرنے سے دریغ نہیں کرتے ہیں۔ بھارتی حکمرانوں کی اس شرمناک پالیسی کو دیکھ کر سردار پٹیل کا ہی وہ خوف ناک قول یاد آتا ہے جو انہوں نے غالباً مجلس احرار کے رہنما سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم سے دوران ملاقات دہرایا تھا کہ ""شاہ جی! ہم بھارتی ہندو آپ کے دشمن نہیں جو عرب سے مسلمان ہو کر ہندوستان آئے ہیں ، بلکہ ہم ان مسلمانوں کے دشمن ہیں جنہوں نے اپنا دھرم چھوڑ کر اسلام قبول کیا تھا۔ ہم ان کو شدھ کرنا چاہتے ہیں"" گویا یہ دوسرا اہم بنیادی نکتہ ہے جس پر بھارت کی پالیسی استوار ہے۔ بھارتی حکمرانوں کی مسلم دشمن پالیسی کی سوچ کا محور ان کا یہی جذبۂ انتقام ہے جس کی نشاندہی سردار پٹیل نے کی تھی اور جس کا اعادہ بھارتی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے ""سقوط ڈھاکہ"" کے موقعہ پر ان الفاظ میں کیا تھا کہ ""آج ہم نے ہزار سالہ ذلت ورسوائی کا بدلہ لیا ہے""

جو سادہ لوح پاکستانی مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ بھارت نے پاکستان کا وجود تسلیم کر لیا ہے، انہیں آل انڈیا نیشنل کانگریس کی وہ قرارداد فراموش نہیں کرنی چاہئے جو کانگریس نے ۳ جون ۱۹۴۷ء کا منصوبہ تقسیم ہند قبول کرنے کے باوجود ۱۵ جون ۱۹۴۷ء کو ان الفاظ میں منظور کی تھی۔ ""جغرافیہ ، پہاڑوں اور سمندروں نے ہندوستان کو ایک ناقابل تقسیم جغرافیائی وحدت بنا دیا ہے جسے کوئی انسانی طاقت تبدیل نہیں کر سکتی۔ نیشنل کانگریس پر امید ہو کر یہ اعلان کرتی ہے کہ وہ وقت ضرور آئے گا جب یہ تلخ دور ختم ہو گا ، حالات صحیح رخ اختیار کریں گے اور دو قومی نظریہ جھوٹا ثابت ہو گا""۔ اندرا گاندھی تو کئی بار کہہ چکی تھی کہ ""میں مسلم قومیت کا خاتمہ دیکھنا چاہتی ہوں""

تاریخ گواہ ہے کہ بھارتی حکمرانوں نے مسلم قومیت کے نظریہ کو فنا کرنے اور اس مقصد کیلئے پاکستان کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ساتھ ہی ان کی ہمیشہ یہ کوشش اور خواہش

بھی رہی ہے کہ بھارتی مسلمان ترک وطن یا ترک مذہب کر کے اپنا وجود اور تشخص ختم کر دیں۔ بھارتی حکومت نے صرف بھارت میں ہی مسلمانوں کی زندگی، مال و دولت، عزت و آبرو کو تباہ و برباد نہیں کیا بلکہ ان بنگالی مسلمانوں کو بھی برداشت نہیں کیا جو آسام میں قبل از تقسیم ہند آباد ہوئے تھے اور جنہوں نے اس صوبے کی بنجر زمینوں کو اپنے خون و پسینے سے آباد کیا تھا۔ یہ مسلمان اسی بنگال سے آئے تھے جس بنگال کے مسلمانوں کی "مظلومیت" کا پرچم لیکر بھارت ۱۹۷۱ء میں اٹھا اور پاکستان پر جنگ مسلط کر دی۔ نوبت بایں جا رسید کہ بنگلہ دیش بھی بھارتی حکمرانوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا ہے اور مسلم بنگال کو خاردار تاروں کے ذریعے محصور کیا جا رہا ہے اور اس کا گھیراتنگ کیا جا رہا ہے۔ کس قدر ستم ظریفی ہے کہ پاکستان میں غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک اور فیاضانہ برتاؤ کو بھارت میں پاکستان کی کمزوری پر محمول کیا جاتا رہا ہے اور بھارت کی ہندو اکثریت اور حکمران طبقہ پر اس کا کوئی خوشگوار اثر نہیں پڑا بلکہ اس کے برعکس بھارتی مسلمانوں پر مسلسل ظلم و تشدد کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں، ان کی تاریخ مسخ کی جا رہی ہے تعلیمی اداروں میں صرف ہندوؤں کی تاریخ پر زور دیا جا رہا ہے، مسلمانوں کی ثقافت اور دینی قدروں کو فنا کیا جا رہا ہے، مسلمان بچے جن کے کانوں میں پیدائش کے وقت "اللہ اکبر" کی آواز گونجتی ہے، سکولوں میں ایک دوسرے کو "السلام علیکم" کی بجائے ہندوانہ طور پر "نمستے" کہتے ہیں۔ کئی مقامات پر مسلمان عورتوں کو ہندوؤں کے ساتھ شادی پر مجبور کیا جاتا ہے۔ مسلمان خواتین کی عزت ہندو غنڈوں کے ہاتھوں ہمہ وقت خطرے میں رہتی ہے۔ بھارتی سیکولرازم ایسا منافق اور بے رحم ہے کہ اس نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو بھی معاف نہیں کیا اور تو اور دیوبند جیسے ادارے کو بھی نہیں بخشا گیا؟ بھارتی سیکولرازم کے فراڈ کا بھانڈا خود اندرا گاندھی نے ہی امریکہ جا کر پھوڑ دیا تھا جب مشرقی پاکستان پر حملہ سے قبل ایک امریکی یونیورسٹی میں اپنا فلسفہ یہ بیان کیا تھا کہ "ہماری مذہبی کتاب گیتا یوں کہتی ہے اور یوں کہتی ہے"۔ بھارتی سیکولرازم محض دنیا کو دھوکہ دینے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کیا پاکستان میں غیر مسلموں کے ساتھ اس قسم کے سلوک کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ہونا چاہئے مگر اس بات کا کیا جواز ہے کہ ایک عرصہ سے پاکستان بھارتی مسلمانوں کے قتل عام پر خاموش تماشائی کی حیثیت اختیار کر چکا ہے؟ اور اگر پاکستان کا پریس کبھی بھولے سے اس تشدد پر اعتراض کر بیٹھے تو اس کو بھارت کے داخلی معاملات میں مداخلت قرار دیا جاتا ہے۔ ہماری حکومتوں کو تو یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ بھارت میں مسلمانوں کے بے جا قتل عام پر کوئی موثر احتجاج کر سکیں جبکہ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر پاکستانی حکومت اس مسئلہ میں سنجیدہ ہو تو یہ قتل عام نہ صرف بند کروایا جا سکتا ہے بلکہ اس پر تو بھارت کا صحیح معنوں میں ناطقہ بند کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ہمیں مسلمانوں کے خون سے زیادہ وحشی ہندو حکمرانوں کی دوستی و خوشنودی عزیز ہے۔

اس پس منظر میں جب پاک بھارت تعلقات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب تک بھارتی مسلمانوں کے ساتھ ظالمانہ سلوک جاری رہے گا اور انہیں قیام پاکستان کی مقدس تحریک میں حصہ لینے کی سزا دینے کا سلسلہ چلتا رہے گا' اس وقت تک بھارت کے ساتھ پاکستانیوں کا "رومان" محض منفی بنیادوں پر دوستانہ تعلقات کے ڈھونگ کے سوا کچھ نہیں۔ وہ بھی میرے خیال میں بجائے خود پرلے درجے کی بے حمیتی ہے بلکہ اللہ کے عذاب کو دعوت دیتی ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ بھارتی مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت ان کی شناخت اور ان کا اسلامی تشخص ہے اور مسلم قومیت کی بقاء میں ان کی بقاء کا راز مضمر ہے۔ اس اعتبار سے پاکستان کے وجود سے ہی جو مسلم قومیت کا مظہر ہے 'ان کا وجود قائم ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے میرا عقیدہ ہے کہ بھارتی مسلمانوں کا خون تو در کنار جو ہمارے ہی گوشت و پوست کا حصہ ہیں بلکہ ہمارے محسن بھائی ہیں، دنیا کے کسی بھی خطے میں رہنے والے مسلمان کے خون کا ایک قطرہ بھی ہمارے لئے اس قدر مقدس ہے کہ اس پر کوئی سودا بازی نہیں کی جا سکتی۔ وقت آ گیا ہے کہ بھارتی حکمرانوں کو پاکستانی مسلمانوں کے اس پختہ عقیدہ اور لافانی نظریہ سے آگاہ کیا جائے کہ وہ بھارتی مسلمانوں کا خون بہانا بند کر دیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں کہ بھارتی مسلمانوں کے قتل عام پر سے گزر کر پاکستان کے ساتھ دوستی کرنے میں کامیابی ہو سکتی ہے۔ قائداعظمؒ کے بعد پاکستان کی حکومتوں نے کسی نہ کسی وجہ سے خواہ وہ ان کی اپنی اندرونی کمزوریاں تھیں 'ان کا احساس کمتری اور سیاسی بصیرت کا فقدان تھا' ایمان و یقین کی خرابی یا اپنی شاندار تاریخ و روایات سے نا آشنائی یا بھارت کی طاقت' حجم اور وزن کے مقابلہ میں اپنی کمزوری اور بزدلی کا احساس تھا' ہر موقع پر اور ہر مسئلہ میں بھارت کے ساتھ یک طرفہ طور پر تعلقات بہتر بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا کہ ہماری طرف سے نیند میں بھی دوستی کا ہاتھ بستر سے باہر کھلا ہوا رہا کہ شاید رات کو بھی کسی لمحہ وہ بت کافر آمادہ بہ تعاون ہو جائے تو ہمارا ہاتھ کہیں پیچھے نہ رہے، مبادا وہ ناراض ہو جائیں۔ کیسے یہ نہ کہا جائے کہ۔

بتوں سے تجھ کو امیدیں' خدا سے نومیدی
ذرا بتا تو سہی اور کافری کیا ہے اقبالؒ

مجھے وہ دور یاد آتا ہے کہ جب پنڈت جواہر لال نہرو بھارت کے وزیراعظمؒ کی حیثیت سے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی دعوت پر پاکستان کے دورے پر آئے تو انہیں ایک "دیوتا" سمجھ کر ان کی خوشامد کی گئی۔ حکومت نے حریت پسند لوگوں کے لبوں پر مہریں اور گفتار پر تعزیریں بٹھا دیں کہ کوئی شخص پنڈت نہرو کے دورہ کے دوران بھارتی مسلمانوں کی حالت زار یا مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کی حمایت میں لب کشائی نہ کرے۔ ہاں ایک شخص ایسا تھا جو اس کو برداشت نہ کر سکا۔ آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے عظیم راہنما چودھری غلام عباس مرحوم، جنہوں نے فیلڈ مارشل سے کہا کہ راولپنڈی میں جو کشمیریوں کی تحریک آزادی کا ایک مرکز ہے پنڈت نہرو کے اعزاز میں کوئی استقبالیہ نہ ہو کیونکہ مسلمانوں کی غیرت کو یہ بہت بڑا چیلنج ہو

گا۔ ایک اور مسلم کانفرنسی کارکن کو بھی یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے سخت حفاظتی اقدامات کے باوجود کشمیر کے بارے میں ایک یادداشت جواہر لال نہرو کی کار کے اندر پھینک دی اور پھر پولیس والوں نے اس کا جو حشر کیا سو کیا۔ چنانچہ اس طرح اس حد تک ہماری قومی غیرت بچ نکلی۔ مگر اس تمام پذیرائی اور خوشامد کا نتیجہ کیا ہوا؟۔ مری کے پر فضا مقام پر جب دونوں حکمران اچھے موڈ میں تھے تو کہتے ہیں کہ ایوب خان مرحوم نے "ہلکے پھلکے" انداز میں کشمیر کی بات کرنا چاہی پہلے تو جواہر لال نہرو اس کے جواب میں پھولوں کے بارے میں بات کر کے ٹالتے رہے۔ پھر آخر میں کہا کہ فیلڈ مارشل صاحب! یہ معاملہ تو منجمد ہو گیا ہے اور واپس "دلی" جا کر پاکستانی حکومت کے بارے میں یہ کہہ کر اس خوشامدی قوم کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کیا کہ "پاکستان میں کسی نے کشمیر کے بارے میں ان سے گفتگو ہی نہیں کی" ماضی قریب میں ہم نے وہ منظر بھی دیکھا جب جنتا حکومت کے وزیر خارجہ مسٹر واجپائی پاکستان آئے تو ان کی بھی وہ خوش آمدی کی گئی کہ یہ "ناپسندیدہ مہمان" جو اپنی مسلم کش پالیسی کی وجہ سے رسوائے زمانہ شخص ہے پاکستان میں اپنے "شاہانہ استقبال" پر پھولے نہیں سماتا تھا، اور ہمارے کئی "باغیرت" لوگ اپنی مغفرت کیلئے اس سے آٹوگراف حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے خواہشمند تھے۔ میں کبھی کبھی اپنے دل سے پوچھتا ہوں کہ وہ کون سا ذلت آمیز طریقہ ہے جو بھارت کو راضی کرنے کیلئے ہم نے اختیار نہیں کیا اور اسے اختیار کرنا ابھی باقی ہے کیونکہ بھارت کے ساتھ دوستی کی خاطر ہر طریقہ آزمایا گیا حتیٰ کہ کشمیر کے مسئلہ پر پاکستان کے مسلمہ قومی موقف کو بھی ' وقتی طور پر ہی سہیٔ خیرباد کہہ دیا گیا یعنی تنازعۂ کشمیر کے تصفیے کے بغیر ہی "جنگ نہ کرنے کا سمجھوتہ" کی پیشکش کی گئی۔ اس امر کے باوجود کہ اس پیشکش میں صرف بھارت ہی کا فائدہ تھا، کانگریسی حکمرانوں نے فی الحال اس سمجھوتہ کو قبول نہیں کیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح مسز اندرا گاندھی کے والد مسٹر نہرو نے فیلڈ مارشل ایوب خان کی یہ پیشکش نامنظور کی تھی کہ دونوں ملکوں کا مشترکہ دفاع کیا جائے۔ ہمارے حکمرانوں کی اس ذہنیت "شاہ سے زیادہ شاہ پسندی" کی وجہ سے اس صدی کے اس تاریخی موقع سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا گیا جو ۱۹۶۲ء میں بھارت چین جنگ کے وقت پاکستان کو ملا تھا بلکہ ہماری اس روایتی فیاضی کو بھی ہماری کمزوری بنا کر اس کا تمسخر اڑایا گیا۔

میں اپنی معلومات کیلئے یہ بات جاننا چاہوں گا کہ پاکستان کی مخالفت میں وہ کون سا قدم ہے، جو اٹھ سکتا تھا اور بھارت نے نہ اٹھایا ہو اور زندگی کا وہ کون سا شعبہ ہے جس میں بھارت نے پاکستان کی مخالفت نہ کی ہو۔ جب بھارت کی سیاست کی بنیاد ہی دراصل پاکستان دشمنی پر ہو تو اس سے کس رعایت کی توقع کی جائے؟ چنانچہ اندرون ملک ہو یا عالمی سطح، بھارت نے پاکستان کی مخالفت کا کوئی ادنیٰ سا موقع بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور اپنے کئے ہوئے وعدے کی پابندی تو در کنار اس وعدے کا نام بھی نہ لیا۔ اس نے صرف ان وعدوں اور معاہدوں کو اپنایا جن میں بھارت کے مفاد کا نام بھی لیا ہو۔ اس نے صرف ان وعدوں اور معاہدوں کو اپنایا جن میں بھارت کے مفاد کا پہلو تھا۔ وہ لیاقت نہرو معاہدہ ہو' تجارتی معاہدے ہوں'

۱۹۴۹ء کا جنگ بندی کا معاہدہ ہو، شملہ ہو یا تاشقند ہو یا نہری پانی ہو، بھارت ہر ایک کو صرف اپنی غرض کی حد تک تسلیم کرتا رہا۔ پاکستان کے مفاد کی کسی بات کو اس نے تسلیم نہیں کیا۔ یہاں تک کہ پاکستان کے خلاف کسی تخریبی کارروائی سے بھارت نے کبھی دریغ نہیں کیا۔ پاکستان کے اندر تخریب کاری کی حمایت میں وہ کون سا عمل ہے جو نہیں کیا گیا۔ تخریب کاروں کو اڈے فراہم کرنا، تربیت دینا، روپیہ سے مدد کرنا۔ پاکستان تو کیا خود مذہب اسلام کے خلاف لٹریچر چھپوا کر تقسیم کروانا ———

——— ہتھیار فراہم کرنا اور پھر مشرقی پاکستان کی طرح فوج لیکر حملہ کرنے تک ہر اس عمل میں بھارت کا ہاتھ نمایاں طور پر موجود ہے جس سے پاکستان کو زک پہنچتی ہو۔ ہمارے برادر پڑوسی ملک افغانستان کے ساتھ اپنی دوستی کے دوران بھارت کا طرز عمل کیا رہا اور اس کی خواہش کیا تھی، کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ ان تمام حالات کا تجزیہ کرنے سے صرف ایک ہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ بھارت کی خواہش واضح طور پر یہ ہے کہ دوستی یکطرفہ ہو اور وہ بھی خود پاکستان کی قیمت پر ہو۔ بعینہٖ جس طرح موجودہ حکومت سیاست دانوں سے یکطرفہ تعاون کی خواہشمند ہے۔ بھارتی حکمرانوں کے طرز عمل سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ وہ خود کو انگریز کے قائمقام کے طور پر مسلمانوں کو غلام بنانا چاہتے ہیں۔ آزادی کا حق صرف ان کیلئے ہے کیونکہ وہ انگریز کے جانشین جو ہوئے۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اس قسم کے لوگ تاریخ میں جہاں کہیں بھی ملتے ہیں وہ نفسیاتی طور پر صرف طاقت کی زبان سمجھتے ہیں۔ شرافت، انسانیت، عدل، انصاف اور آزادی سب ان کے نزدیک محض فریب کاری کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ لوگ تو دنیا کے مشہور اور فریب کاری کے جدامجد پنڈت چانکیہ کے جانشین اور شاگرد رشید جو ہیں اور پھر دوستی کے بارے میں ان کی معروف مذہبی کتاب گیتا کی جو ہدایات ہیں ان کی موجودگی میں اور کیا توقع ہو سکتی ہے۔ ان کے ہاں دوستی کا فلسفہ یہ ہے کہ جب کسی سے دشمنی کرنا ہو تو اس سے دوستی کرو، پھر گلے لگاؤ اور پشت میں چھرا گھونپ دو اور پھر اس کی لاش پر ماتم کرو۔ کیونکہ وہ دوست جو ہوا! یہی وہ فلسفہ ہے جس پر ہمارے ساتھ بھارت اپنے تعلقات استوار کر رہا ہے۔ نہری پانی کا مسئلہ جو خود پاکستان کی بقاء کا مسئلہ ہے اس پر بھی بھارتی حکومت نے پاکستان کی امن پسندی اور فراخدلی کو کمزوری سمجھ کر ناجائز فائدہ اٹھایا۔ دریائے چناب پر "سلال بند" اور کشتواڑ مقبوضہ کشمیر کے قریب ایک نئے بند کی تعمیر سے پاکستان کے حقوق پامال ہو رہے ہیں۔ گویا پاکستان سے یہ توقع کی جا رہی ہے کہ وہ اس امر کا نظارہ کرے کہ کس طرح بھارت اس کے لہلاتے ہوئے کھیتوں کو جب چاہے ویران کر دے۔ مگر ہم ہیں کہ ان دریاؤں پر جو جموں و کشمیر سے گزرتے ہیں کنٹرول حاصل کرنے کیلئے ایک خوددار قوم کی طرح منصوبہ بندی نہیں کرتے بلکہ کرنا تو کجا سوچتے بھی نہیں ہیں۔ صرف اس لئے کہ اس سے بھارت ناخوش ہو گا۔ گویا ہمیں بھارت کی خوشنودی اپنی بقاء سے بھی زیادہ عزیز ہے یا پھر ہم نے اپنے دل میں اس کا اتنا خوف بٹھالیا ہے کہ ہم بھلائی اسی میں سمجھتے ہیں اور لطف یہ کہ بھارت بھی ہماری نسبت یہی گمان و توقع رکھتا ہے بلکہ عین اپنا حق سمجھتا ہے۔ کیوں نہ ہو جبکہ

خود ہمارے حکمران بھارتی حکمرانوں سے یہ کہیں کہ " جناب! ہمارا وجود تو آپ کیلئے ضروری ہے تو پھر کون سی حد فاصل باقی رہ جاتی ہے کہ ہم اس کی خوشنودی کو اپنی بقاء پر ترجیح دیں۔ کتنی سادگی ہے۔ سبحان اللہ۔ گویا

؎ "ہم تو زندہ ہیں کہ دنیا میں تیرا نام رہے"

فکر کی اس آزادی پر کوئی داد دیئے بغیر رہ سکتا ہے۔ مگر پھر وہ کافر ہے کہ ہماری یہ عاجزی سن کر بھی ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ بہرحال یہ کوئی سربستہ راز نہیں ہے کہ نہری پانی کا مسئلہ ہمیشہ کیلئے حل کرنے کا راز کشمیر کی آزادی میں ہی مضمر ہے اور ملت اسلامیہ پاکستان اس نکتہ کو جتنی جلدی سمجھ لے اتنا ہی بہتر ہو گا۔ سمجھتے تو کیوں نہیں ہوں گے مگر پسپائی کی پالیسی کو ترک کرنا پسند نہیں ہے یا اس کی ہمت نہیں ہے۔ گویا ہماری ذہنیت ہی ایسی بن گئی ہے۔

مسئلہ کشمیر پر میں پرامن مذاکرات کا مخالف نہیں ہوں کیونکہ باہمی مذاکرات بھی مسئلہ کشمیر کا ایک حل ہے۔ مگر بھارت کو دوٹوک الفاظ میں یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ یہ ہیں وہ امور جن پر ایک ساتھ بات چیت کرنا اگر مقصود ہو تو کی جائے ورنہ لایعنی مشقیں کرنے سے کیا حاصل ہو گا؟ اگر ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے اور خدانخواستہ اتنے لاچار اور بے بس ہو چکے ہیں (جو اگرچہ یقیناً نہیں ہیں) کہ کشمیر کے بین الاقوامی طور پر طے شدہ سوال پر اپنے مضبوط اور منصفانہ موقف پر ڈٹ کر بات نہیں کر سکتے تو سردست خاموش ہی رہیں اور بہتر وقت اور مناسب ماحول کا انتظار کریں جو کسی وقت بھی میسر آ سکتا ہے۔ مگر ایسا تو ہرگز نہ کریں جس سے اس مملکت خداداد کی بنیادوں کو ہی ضعف پہنچے اور ان شہیدوں اور مجاہدوں کی قربانیاں خاک میں مل جائیں جنہوں نے حصول پاکستان اور جہاد کشمیر میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ تمام لوگ خدانخواستہ یہ سوچنے لگیں کہ کہیں پاکستان کا بننا ہی کوئی غلطی تو نہ تھی یا جو اس تقسیم کو غلطی قرار دیتے تھے، ان کی تائید کرنے لگیں۔ اس ضمن میں یہ کہنا بھی بے محل نہ ہو گا کہ اس سے ہرگز نہ سمجھا جائے کہ مسئلہ کشمیر پر جنگ کے سوا کوئی حل نہیں ہے۔ جیسا کہ ہمارے بعض افلاطون آئے دن کہتے رہتے ہیں۔ اور جنگ میں ظاہر ہے کہ ہم پہل کر ہی نہیں سکتے۔ یقیناً اس کے کئی دوسرے راستے بھی ہیں۔ جس سے بھارت پر مؤثر اور بامقصد دباؤ ڈالا جا سکتا ہے۔ مگر یہ باتیں تو صاحب یقین اور صاحب بصیرت قیادت پر موقوف ہیں جس کا ہنوز انتظار ہے "ورنہ گلشن میں علاج تنگئ داماں بھی ہے"۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ بھارت کے ساتھ "دوستی" کا شوق ہمارے ہاں "معاشقے" کی حد تک بڑھ گیا ہے جس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ اگست ۱۹۵۳ء میں مقبوضہ کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ کی بغاوت ان کی برطرفی اور عام بغاوت کے موقع پر سری نگر اور گردونواح کے ہزاروں مسلمانوں کو جب شہید کیا گیا جو شیخ عبداللہ کے نظریات سے قطع نظر پاکستان کے ساتھ الحاق کی خاطر قربانیاں دے رہے تھے۔ تو ستم دیکھئے کہ پاکستان کے اس وقت کے وزیر اعظم جو وفات پا چکے ہیں "دلی" جا کر دوستی کی ترنگ میں "تلک" لگا کر یہ

اعلان کر رہے تھے کہ بھارتی فوج کا مسلمانوں کے قتل عام میں کوئی ہاتھ نہیں اور حالات پر سکون ہو رہے ہیں۔ ایک دوسرے موقع پر ہمارا ایک وزیر تو چند قدم اور آگے چلا گیا اور خود بھارت میں جا کر یہ اعلان کیا کہ "دونوں ملکوں کے درمیان یہ مصنوعی حد بندیاں جلد ختم ہونا چاہئیں" اس سے قبل اور اس کے بعد کئی مواقع پر کشمیر کے مسئلہ پر ہماری حکومتوں کا طرز فکر اور طرز عمل ناقابل فہم اور مجرمانہ حد تک بزدلانہ رہا ہے۔ جس سے حوصلہ پا کر تھوڑا عرصہ ہوا بھارت کی وزارت خارجہ نے پاکستانی سفیر کو اپنے دفتر میں بلا کر یہ کہنے کی جسارت کی کہ "بتاؤ آزاد کشمیر کب خالی کر رہے ہو" اس سے آگے اور کیا ہو گا؟ جہاد کشمیر کے ابتدائی ایام میں قائداعظمؒ کے اس واضح حکم کے باوجود کہ "بھارت کو کشمیر پر بزور شمشیر قابض رہنے کا حق نہیں دیا جائے گا" بعض ذمہ دار افراد نے تحریک آزادی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا حتیٰ کہ اگر مجاہدین کشمیر خود ہمت نہ کرتے تو موجودہ آزاد کشمیر بھی اس مجرمانہ غفلت کی نذر ہو گیا ہوتا۔ کشمیر کے مسئلہ پر بھارت کی سینہ زوری اور جارحانہ عزائم اب اس حد تک پہنچے ہیں کہ بھارت نے گلگت میں صدر پاکستان کی طرف سے غیر ملکی سفیروں کے اعزاز میں استقبالیہ پر احتجاج کیا اور ادھر اقصائے چین کے بارے میں خود عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ سودا بازی کی کوشش کی جس چین نے کشمیر کے مسئلہ پر ہمیشہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کی حمایت کی ہے۔

یہ امر اب کوئی راز نہیں۔ اس پر دنیا میں کتابیں چھپ چکی ہیں۔ بھارت کی سلامتی کے ماہرین اور پالیسی ساز حضرات مسلسل اس یقین کا اظہار کر رہے ہیں کہ بھارت کی تمام تر مشکلات اور مسائل کا حقیقی سبب صرف پاکستان کا وجود ہے اور جب تک وہ ختم نہیں ہوتا ان مشکلات کا کوئی حل نہیں۔ ایک عرصہ سے بھارت کی سرکاری پالیسی کا اصل اصول یہی رہا ہے۔

ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ بھارتی حکومت جنگی مشقوں کی آڑ میں پاکستان پر حملہ کے لئے سرحدات پر آ پہنچیں۔ اور اسے اتفاق ہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ حادثہ ہوتے ہوتے بچ گیا اور صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق جو بھارت کے معاملے پر اپنے نرم رویہ کیلئے بدنام ہیں۔ وہ کرکٹ ڈپلومیسی کے نام سے بھارت جا پہنچے جس سے اس تلخی کے ماحول کے زہر کو تحلیل کرنے میں مدد ملی۔ مجھے اگرچہ صدر پاکستان کی پالیسی پر ہمیشہ اعتراض رہا ہے لیکن مجھے یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ ان کی اس پالیسی نے جو زہر کے گھونٹ پینے کے مترادف ہے 'اس ایشیائی خطے میں امن قائم رکھنے میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا ہے اور بھارت کو پاکستان پر حملہ کرنے کا حیلہ بہانہ بنانے کا موقع نہیں ملا۔

اس خطرے کے فوری طور پر ٹل جانے کے بعد بھارت نے اپنے دفاعی اخراجات میں ۴۳ فیصد کا اضافہ کیا ہے جس کا مقصد کوئی ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ بھارتی حکمرانوں کے اعصاب پر ایشیائی قیادت کا بھوت سوار ہے اور اس غرض کے لئے وہ اپنے تمام چھوٹے پڑوسیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ بھارت کا کوئی چھوٹا پڑوسی ملک ایسا نہیں ہے جس کے ساتھ بھارت کے تعلقات کسی بھی اعتبار سے

دوستانہ ہوں یا قابل اعتماد ہوں حتیٰ کہ خود بنگلہ دیش بھی جو بھارت کے حکمرانوں کے سازشوں کی پیداوار ہے 'بھارت کی ہوس کا نشانہ بن رہا ہے۔

بھارتی قیادت فطری عمل کے تحت زوال پذیر ہے اور بھارت کا وجود قیادت کی نسبت بڑا ثابت ہو رہا ہے جس کے نتیجے میں ان کے نت نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں جن کو حل کرنے کی ان میں صلاحیت نہیں ہے۔ اس لئے بھی وہ اپنے چھوٹے پڑوسی ملکوں کے ساتھ تلخی کا ماحول قائم رکھنا چاہتے ہیں کہ شاید اس طرح اندرونی مسائل سے ایک حد تک نجات مل سکے۔ حالانکہ بھارت ایک بڑے ملک کی حیثیت سے اگر چھوٹے ملکوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتا 'ان کی سلامتی کی حفاظت میں ان کی مدد کرتا تو کسی دباؤ کے بغیر یہ تمام چھوٹے ملک خود بخود بھارت کی سلامتی میں ممد و معاون ثابت ہوتے۔

میری پختہ رائے ہے اگر بھارت نے اپنا یہ طرز عمل تبدیل نہ کیا جس کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی تو پھر بھارت کے ان جارحانہ اور توسیع پسندانہ عزائم سے بچنے کیلئے بھارت کے چھوٹے پڑوسی ملکوں کے لئے اور کوئی راستہ نہیں کہ سارک کو چھوڑ کر ایک اور تنظیم قائم کریں جو بھارت کو چھوڑ کر چین سمیت ایشیائی ملکوں پر مشتمل ہو۔

ماضی کی ان داستانوں اور ہماری بعض عدیم المثال غلطیوں کو تحریر میں لانے سے میرا مدعا یہ ہے کہ بھارت کے ساتھ نیک خواہشات کی تمنا اور کمزوری کے مظاہرہ سے پاکستان ایک باعزت اور پائیدار امن کے حصول میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ان تعلقات کو جنہیں " پاک بھارت تعلقات " کہا جاتا ہے یکطرفہ نہیں دوطرفہ ہونا چاہئے اور فریق ثانی کی طرف سے اس کی نیک نیتی کا کوئی عملی ثبوت بھی نظر آنا چاہئے۔ ان بنیادی امور سے جو ان تعلقات کی راہ میں حائل ہیں اور جو ان تعلقات کی بگاڑ کا اصل اصول ہیں 'چشم پوشی کرنا خود کو محض خود فریبی میں مبتلا کرنا ہو گا۔ یہ بنیادی امور کیا ہیں؟ مختصراً یہ کہ " بھارت اس بات کو کسی ذہنی تحفظ کے بغیر ہمیشہ کیلئے تسلیم کرے کہ پاکستان کا وجود ایک صداقت اور اٹل حقیقت ہے۔ آئندہ کیلئے بھارت اس مسلم ریاست یعنی پاکستان کے وجود اور بقاء کے خلاف تمام ظاہری اور خفیہ کارروائیاں بند کرے اور برابری کی سطح پر پاکستان سے معاملات طے کرے۔ بھارت کی جنگی تیاریوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے پاکستان اپنے آپ کو خطرے میں گھرا ہوا محسوس کرنے میں حق بجانب ہے کیونکہ بھارت کے ہمسایوں میں سے ان فوجی تیاریوں کا ہدف صرف پاکستان ہی رہا ہے اور رہے گا۔ جہاں تک چین یا روس کا تعلق ہے 'بھارت ان عظیم طاقتوں کے ساتھ لڑنا چاہتا ہے نہ لڑ سکتا ہے۔ یہ تمام فوجی تیاریاں یقیناً پاکستان پر ایک آخری اور بھرپور وار کرنے کیلئے ہی ہیں۔ بھارت کے اور ہمارے درمیان اصل اور حل طلب مشکل یہ ہے کہ ہماری آزادی کا دارومدار نظریہ پر ہے۔ جبکہ بھارت کیلئے یہی مشکل ہے کہ وہ اپنے دروازے پر اسلام کے نام پر ایک حکومت کو قائم و دائم رہنے دے۔ اس کی خواہش تو یہ دکھائی دیتی ہے کہ ہم خود ہی چپکے سے کسی جھگڑے اور فساد کے بغیر ہی اس کی اس ناپاک خواہش کی تکمیل کر دیں تو اچھا ہے۔

بلکہ بھارت کو اس پر بھی شدید اعتراض ہے کہ پاکستان اپنے دفاع کی تیاری کیوں کرتا ہے۔ ایسی تیاری کو بھارتی حکومت اپنے خلاف حملہ کی کارروائی بتاتی ہے اور دنیا بھر میں احتجاج کرتی ہے کہ پاکستان بھارت پر حملہ کی تیاریاں کر رہا ہے۔ گویا ان کے نزدیک یہ بھی جارحیت ہے اور قابل سزا بے ادبی ہے کہ ہم بھارت کے متوقع حملہ کا دفاع کرنے کی تیاری کریں۔

بھارتی حکمران یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ ہندو اور مسلمان دو علیحدہ قومیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسز اندرا گاندھی مسلم قومیت کے خلاف پے در پے حملے کرتی رہی ہیں یہاں تک کہ بھارت نے "اسلامی ملکوں کی بین الاقوامی تنظیم" کو بھی اقوام متحدہ میں ایک فرقہ پرست ادارہ قرار دیا ہے۔ پاکستان میں بھی بھارت علاقائی اور نسلی اختلافات کو جو خود بھارت میں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں، ہوا دے رہا ہے۔ جس کا تازہ ثبوت پاکستان کے داخلی معاملات میں بھارت کی مداخلت ہے۔ جس سے وہ انکار بھی نہیں کرتا۔

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

بھارتی مسلمانوں کے اس سفاکانہ قتل عام اور ان کی تحقیر و تذلیل کے ہوتے ہوئے بھارت کے ساتھ خوشگوار تعلقات کیسے قائم ہو سکتے ہیں۔ تعلقات کا بہتر ہونا تو درکنار بھارتی حکمرانوں پر یہ واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ بھارتی مسلمانوں کے قاتل پاکستانی مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے۔ بھارتی لیڈروں اور حکمرانوں کے اس خوف کا کسی کے پاس کوئی علاج نہیں ہے کہ برابری کی سطح پر ان تعلقات کی بہتری سے نہ صرف بھارت کے مسلمانوں پر دباؤ کم کرنا ہو گا اور ان کی شدھی کا منصوبہ ترک ہو جائے گا بلکہ اس سے یہ خوف بھی کچھ بے جا نہیں ہے کہ آج انسانیت جس گمشدہ شے کی تلاش میں ہے وہ اسے صرف اسلام ہی مہیا کر سکتا ہے۔ تو گویا اس طرح مسلمانوں کی شدھی کی بجائے خود غیر مسلموں کے اسلام قبول کرنے کا عمل تیز ہو جائے گا۔ مگر یہ نہ بھولنا چاہئے کہ یہ عمل ہم نالائق مسلمانوں کا محتاج ہے نہ ہمارا انتظار کرے گا۔ وہ تمام کوششیں جو بھارت کی متعصب ہندو قیادت کر رہی ہے وہ بالآخر ناکام ثابت ہوں گی۔ وقت کا کوئی ایک ریلہ آئے گا اور اس سب کئے کرائے کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا۔ یہ تو ایک فطری عمل ہے، اس کو روکنے میں کیوں وقت اور وسائل کو ضائع کیا جائے۔

ان بنیادی امور میں جن کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ کشمیر کا مسئلہ بھی اسی طرح ایک ایسا اہم مسئلہ ہے جس سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ پاکستان کا بنیادی قومی مسئلہ ہے اور کشمیری مسلمانوں کیلئے تو "موت و حیات" کا سوال ہے۔ مسئلہ کشمیر کو حل کئے بغیر بھارت کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کی درستگی اور دوستی نہ صرف مصنوعی اور غیر یقینی ہو گی بلکہ ہمارے لئے تو خدانخواستہ یہ "سقوط ڈھاکہ" کے المیہ سے بھی بڑا المیہ ہو گا۔ اپنی شاہ رگ کو دشمن کی تلوار کے نیچے رکھ کر دوستی کیلئے ہاتھ بڑھانا کیا معنی رکھتا ہے۔ کون باغیرت مسلمان اپنے محسن اور بانئ پاکستان کا یہ تاریخی اور حقیقی ارشاد بھول سکتا ہے کہ "کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے" اس حقیقت سے انکار کرنا محض خود فریبی ہے کہ مسلم کشمیر پر بھارت



آغا محمد یحییٰ خان

کا غاصبانہ قبضہ پاکستان کے وجود پر براہ راست حملہ کے مترادف ہے اور کشمیر کو ہڑپ کرنا گویا اکھنڈ بھارت کے طویل المیعاد منصوبہ کا ایک حصہ ہے۔ ہمارے لئے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے سے کس طرح نجات ہو سکتی ہے؟ حقیقت کے ساتھ تو آنکھیں چار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس موضوع کو قدرے وضاحت کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہے۔ بھارتی حکمرانوں کو اس بات کا بخوبی احساس اور علم ہے کہ اگر کشمیر پاکستان کے ساتھ مل جائے تو ان کا اکھنڈ بھارت کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو گا۔ میں پوری قوت اور نہایت دیانت داری کے ساتھ اس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں بیان کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ اگر خدانخواستہ ہماری حکومت کشمیر کے مسئلہ پر اپنی کمزوری یا عدم بصیرت کے باعث بھارت کے دام ہمرنگ زمیں میں پھنس جاتی ہے جو اس نے بچھار کھا ہے تو کسی بھی دلیل کے مطابق یہ اقدام خود کشی ہو گا اور خود پاکستان کے وجود کی نفی سے کم نہیں ہو گا۔ کشمیر پر جو ہر لحاظ سے ملت اسلامیہ پاکستان کا جزو لاینفک ہے، بھارت کا غاصبانہ قبضہ تسلیم کر کے پاکستان نہ ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی حیثیت سے زندہ رہ سکتا ہے اور نہ دنیائے اسلام کے اتحاد و استحکام میں کوئی کردار ادا کر سکتا ہے۔ اور ادھر اسی بنیادی حقیقت کا علم اور احساس ہے جو بھارت کو بھی کشمیر پر اپنا قبضہ ہر قیمت پر قائم رکھنے پر مجبور کر رہا ہے۔ بعض عاقبت نااندیش جو یہ کہہ دیتے ہیں کہ کشمیر کے بغیر اب تک جو ہم زندہ ہیں تو مستقبل میں کیوں نہیں زندہ رہ سکتے تو بحث کا محل نہیں ہے۔ تو وہ لوگ اپنی زندگی کے شعور سے محروم ہیں یا دشمن کی سازشوں سے بے خبر ہیں اور وہ خود پاکستان کے وجود کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ چنانچہ یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ اگر میں اپنے اس بظاہر بڑے ہی سخت نقطہ نظر کی تھوڑی سے مزید وضاحت کر دوں " بھٹو صاحب مرحوم نے جبکہ وہ پاکستان کے صدر تھے کشمیر کے سوال پر ایک اعلیٰ سطح کا اجلاس طلب کیا جس میں ان کے وزراء محمود علی قصوری، جے رحیم، خورشید حسن میر اور بعض اعلیٰ حکام کے علاوہ سردار محمد ابراہیم خان، مسٹر کے ایچ خورشید اور راقم الحروف شامل تھے اس اجلاس کی پوری کارروائی اور بحث و مباحثہ میں دو تین باتوں کا حوالہ دینا میں ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک یہ کہ بھٹو صاحب نے کہا کہ

"ہمیں حقائق سے چشم پوشی نہیں کرنا چاہئے"

ظاہر ہے مقصد یہ تھا کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد مسئلہ کشمیر پر جو حقیقی صورت حال موجود ہے اس کو مد نظر رکھنا چاہئے یعنی بھارت اپنے حجم، طاقت اور قبضہ کی بدولت کشمیر کے جس حصہ پر قابض ہے وہ اس سے چھین لینا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ مگر جیسا کہ واقفان حال جانتے ہیں بھٹو مرحوم گفتگو اور مذاکرات کے بادشاہ تھے۔ انہوں نے اس مختصر جملہ کے سوا جس کا ذکر آچکا ہے، کشمیر کے مستقبل پر کھل کر اپنا کوئی عندیہ ظاہر نہیں کیا۔ بھٹو صاحب کے اس ارشاد کے بعد ان کے ایک وزیر نے محض شکست خوردگی اور عدم بصیرت کے آئینہ دار بہت سے دلائل دیئے جو نامعقول ہونے کے علاوہ محض مفروضوں پر مبنی تھے جس کا ذکر ان شاء اللہ پھر کسی نشست میں کروں گا لیکن آخر میں انہوں نے جو ارشاد فرمایا کہ " مستقبل قریب



ذوالفقار علی بھٹو، سردار ابراہیم اور سردار عبدالقیوم تقریر کرتے ہوئے

میں جس کا مطلب دس پندرہ سال ہے، کشمیر کے مسئلہ پر ہم کچھ نہیں کر سکتے جبکہ اس دوران چند دوسرے خطرات لاحق ہو جائیں گے۔ محض دور کی کوڑی لانے کے مترادف تھے۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ فی الحال آزاد کشمیر کو ہی پاکستان کے ساتھ ملا دیا جائے " غالباً آزاد کشمیر کو صوبہ بنانے کی ان کی یہ تجویز تھی۔ اس اثناء میں بھٹو صاحب نے ایک اور مرحلہ پر سلسلۂ گفتگو شروع کرتے ہوئے کے۔ ایچ خورشید کو مخاطب کرتے ہوئے ان کے سیاسی نظریہ "حکومت آزاد کشمیر کو غیر ممالک سے تسلیم کرانے" کے بارے میں یہ تاریخی جملہ کہہ دیا۔

"خورشید! آپ آگ سے کھیل رہے ہیں"

آزاد کشمیر کو صوبہ بنانے کیلئے کچھ اور بھی پیش رفت ہوئی تھی جو خدا کے فضل و کرم سے ناکام ہو گئی۔ وہ قصہ بھی کافی تفصیل طلب ہے اس کے بیان کا یہ محل نہیں ہے۔ بہرحال میں نے اس اعلیٰ سطح کے اجلاس میں جواباً پہلے دو امور کے بارے میں جو کچھ کہا، اگرچہ وہ بہت طویل ہے مگر یہاں مختصراً بیان کرتا ہوں تاکہ ریکارڈ درست رہے۔ حقائق کو تسلیم کرنے کے بارے میں بھٹو صاحب کو میں نے ان کی ہی وہ تقریر یاد دلائی جو انہوں نے وزیر خارجہ کی حیثیت سے اقوام متحدہ کے اجلاس میں کی تھی اور جس میں انہوں نے بھارتی مندوب کی طرف سے اس طرح کی بعض حقیقتوں کو تسلیم کرنے کے مطالبہ کے جواب میں ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔ بھٹو صاحب نے جواباً جو کچھ کہا تھا وہ میں نے انہیں یاد دلایا اور کہا۔

"یہ حقیقت بھی جس کا ذکر کیا گیا ہے کوئی مستقل یا اٹل حقیقت نہیں ہے بلکہ کسی وقت بھی تبدیل ہو سکتی ہے اور حالات کے تابع ہے، حالات کے ساتھ ساتھ یہ بھی بدل جائے گی۔ اور حالات کو بدلنے کی ذمہ داری ہم پر ہے"

دوسری تجویز کے بارے میں جو ان کے وزیر صاحب نے پیش کی تھی میں نے جواب میں جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ ہے۔

"کہ جہاں تک حد متار کہ جنگ پر مسئلہ کشمیر کو ختم کرنے کا تعلق ہے، آپ اگر ہمیں یہ بات سمجھا دیں اور اس کی ذمہ داری لیں کہ ایسا کرنا پاکستان کی بقاء کی خاطر ضروری ہے اور اس طرح بھارت پاکستان کے خلاف اپنے تمام جارحانہ ارادے اور ناپاک عزائم ترک کر دے گا اور جو کچھ وہ پاکستان کے خلاف کرتا رہا ہے اس سے دست بردار ہو جائے گا اور پاکستان کے خلاف دباؤ کی پالیسی جس کو فوجی اصطلاح میں "Leaning against the enemy" کہتے ہیں ترک کرے گا اور اکھنڈ بھارت کے خواب دیکھنا بند کر دے گا، تو آپ تکلیف نہ کریں میں کشمیری عوام کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے کھڑا ہو کر یہ کہوں گا کہ ہم نے ساٹھ لاکھ سے زائد کشمیری مسلمانوں کو اپنے نو کروڑ پاکستانی بھائیوں کیلئے قربان کر دیا ہے۔ لیکن

اگر کشمیر حد متارکہ جنگ پر تقسیم کرنے کے بعد بھی یہی حالات نہ صرف جوں کے توں رہیں بلکہ بھارت کے جارحانہ عزائم کی تکمیل کیلئے فضا اور بھی زیادہ ساز گار ہو جائے اور پاکستان کیلئے خطرات پہلے سے کئی گنا زیادہ بڑھ جائیں تو پھر ہم کس خوشی میں کشمیر اور کشمیری مسلمانوں کو قربان کر ڈالیں"۔

اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا کہ "ان خطرات میں کیسے اضافہ ہو گا منجملہ ان کے ایک معاملہ خالصتاً دفاعی نوعیت کا ہے! اگر یہاں کشمیر کا نقشہ ہوتا اور آپ کے فوجی مشیر بھی موجود ہوتے تو میں بتلاتا کہ اس قسم کی تقسیم سے کیسے پاکستان کیلئے خطرات میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے" میری گفتگو کا ماحصل یہ تھا۔

"کہ جب آپ حق خود ارادیت کے اصول کو تسلیم کرنے کے بعد اس اصول کو ترک کر کے کشمیر میں حد متارکہ جنگ پر ہماری ریاست کو تقسیم کرنے کی خاطر بھارت سے بات چیت پر آمادہ ہو جائیں گے تو بھارت بڑا ملک ہونے کے اعتبار سے اور اپنی بد نیتی کے باعث لازماً یہ مطالبہ بھی کرے گا کہ اس "سیز فائر لائن" کو مستقل سرحد بنانے کیلئے ضروری ہے کہ اس کے یہ کونے گوشے یوں سیدھے کئے جائیں اور یوں نہ کئے جائیں ظاہر ہے کہ اپنے بنیادی اصول کو ترک کرنے اور مستقل امن قائم کرنے کے فریب کو تسلیم کرنے کے بعد ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ بھارت یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ "چونکہ سیز فائر لائن پر اب مستقل بنیادوں پر سمجھوتہ ہو رہا ہے اس لئے پاکستان جن مقامات پر بہتر جنگی پوزیشن میں ہے اس میں بھی تبدیلی لائی جائے تاکہ دلوں میں کوئی شک و شبہ نہ رہے۔ بھارت کا یہ مطالبہ بھی ہو گا اور جائز ہو گا کہ تنازعۂ کشمیر کے تصفیہ کے بعد پاکستان نہ اب اتنی بڑی فوج رکھ سکتا ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اتنے زیادہ دفاعی اخراجات برداشت کر کے پاکستان بلاوجہ بدگمانی کی فضا باقی نہ رہنے دے' اس سے بھی انکار کی گنجائش نہ ہو گی۔ پھر بھارت فوج کی نگرانی کا بھی جائز طور پر یہی حق مانگے گا۔ میں نے مزید کہا کہ اگر ایسا ہو جائے اور اس صورت میں لازماً یہی ہو گا کیونکہ اس سے قبل بھی دوبار متارکہ جنگ کے سلسلہ میں ایسا ہو چکا ہے اور ہم نے "عنایت خسروانہ" کے طور پر اہم چوکیاں اور مقامات بھارتی فوج کے حوالہ کی تھیں۔ تو سیز فائر لائن "ایک بار کانٹ چھانٹ کے بعد ایک مستقل خطرے کی لائن میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جہاں سے نہ صرف آزاد کشمیر کی پوری آبادی بلکہ دارالحکومت "اسلام آباد" بھی دشمن کی "دور مار توپوں کی زد میں آجاتا ہے"

بات خاصی طویل اور جذباتی ہو گئی تھی تاہم اپنے اس موقف کے حق میں دلائل دیتے ہوئے جب میں نے یہ کہا۔

"تو کیا مسئلہ کشمیر کو حد متار کہ جنگ پر ہم یونہی اپنے خلاف اور دشمن کے حق میں ختم کرنا چاہیں گے"

تو بھٹو مرحوم جو کرسی پر پیچھے کی طرف لمبی ٹیک لگائے ہوئے تھے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور اپنے روایتی جذباتی انداز میں کہا:۔

"یہ تجویز (یعنی سیز فائر لائن پر کشمیر تقسیم کرنا) نہ میری ہے اور نہ میری کابینہ سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ یہ اس شخص کی اپنی ذاتی رائے ہے جب تک میں زندہ ہوں کشمیر پر کوئی سودے بازی نہیں ہو سکتی ہے۔"

میں نے مسئلہ کشمیر کے سردست حل نہ ہو سکنے اور جوں کی توں پوزیشن میں رکھنے کے بعض مفادات کا بھی ذکر کیا تھا جو کسی دوسری جگہ انشاءاللہ تحریر کروں گا۔ یہ حوالہ میں نے اس لئے دیا ہے تا کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ کشمیر جیسے انتہائی اہم اور حساس مسئلے پر موجودہ حالت پر بات ختم کر دینا گویا بھارت کو کھلی چھٹی دینا ہے کہ اپنی پوزیشن مضبوط کرتا رہے اور وقت آنے پر بھرپور جارحیت کر سکے۔ ایسی حالت میں دوستی اور عدم جارحیت کے معاہدے کرنا کہاں کا انصاف ہے اور کہاں کی دانائی ہے؟ ایسے معاہدوں کا مطلب تو یہ ہو گا کہ ہم اپنے ہاتھ پاؤں باندھ دیں اور دشمن کو تلوار دیکر کھلا چھوڑ دیں۔ اس میں مضمر 'دانشمندی' سے کون انکار کر سکتا ہے؟

مختصر یہ کہ بھارت اور بھارت کے حکمران اگر خلوص نیت کے ساتھ پاکستان کے ساتھ پائیدار بنیادوں پر دوستانہ تعلقات کے خواہاں ہیں تو سارا پاکستان اور کشمیر اس کیلئے تیار ہے مگر شرط وہی ہے کہ بھارت پاکستان کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کا احترام کرے، پاکستان کی آزادی اور خود مختاری کو دل سے تسلیم کرے اور مسلم قومیت کے خلاف پروپیگنڈا اور اکھنڈ بھارت کے خواب دیکھنا چھوڑ دے۔ مسلم قومیت کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کوئی خصوصی رعایت نہیں ہے جو مانگی جا رہی ہے بلکہ یہ وہی استحقاق ہے جو بھارت میں بسنے والی دوسری تمام قوموں کو حاصل ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ بھارت میں مسلمانوں کی جان و مال عزت و آبرو، مذہب اور تہذیب پر حملے بند کئے جائیں جو ان کا حق ہے۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان مستقل امن کے قیام کیلئے مسئلہ کشمیر کا تصفیہ ضروری ہے اور یہ تصفیہ اقوام متحدہ کی ان قرار دادوں کے عین مطابق ہونا چاہئے۔ جن قرار دادوں کو ایک بین الاقوامی معاہدے کی حیثیت حاصل ہے۔ میرے خیال میں ان بنیادی امور کو طے کئے بغیر ان دو پڑوسی ملکوں کے

باہمی تعلقات خراب تو ہو سکتے ہیں۔ ان میں کسی بہتری کی امید رکھنا

"ایں خیال است و محال است و جنون"

ہی ہو گا ——— یہ بھی اب ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہماری جانب سے جس قدر پیش قدمی اور پیش رفت ہوئی ' بھارت کی جانب سے اسی قدر انکار اور منفی طرز عمل اختیار کیا گیا۔ نوائے وقت ' نے اپنے حالیہ اداریہ میں اس کا جو تجزیہ زیر عنوان "ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار" کیا ہے وہ اس صورت حال کی صحیح غمازی کرتا ہے۔ اور عجیب تر یہ کہ بجائے اس کے کہ ان کی بیزاری ہماری غیرت کو جھنجوڑتی ' ہمارا اشتیاق اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے۔ شاعری ' ناولوں اور افسانوں میں تو اس طرز عمل کا سراغ ملتا ہے مگر ملکوں کے سیاسی تعلقات میں یہ رومان پروری اپنی مثال آپ ہے۔ ماضی قریب میں بالعموم اور آج کل بالخصوص ان دو طرفہ تعلقات کا ضرورت سے زیادہ چرچا ہے۔ پاکستان کے طرز عمل سے تو بلاشبہ یوں معلوم ہوتا ہے گویا ان تعلقات کی بہتری میں صرف پاکستان کا ہی مفاد ہے اور بھارت سے ہم گویا ان تعلقات کی بہتری کی بھیک مانگ رہے ہیں یعنی وہ از راہ کرم اور عنایت ہمیں کچھ عطا کرنے والے ہیں۔ بھارت کا طرز عمل بھی بالکل یہی ہے کہ وہ کیوں ہم پر کرم فرمائیں؟ ہمیں ایک یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ جب تک ہم بھارت کو یہ احساس نہیں دلا سکتے کہ ان تعلقات کی بہتری اس کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے ' تب تک کسی مثبت رویے کی توقع کرنا محض تضیع اوقات اور خالص حماقت ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بھارت کا رویہ سیاسی نہیں ہے وہ حسابی ہے "دو ضرب دو چار" والا ہے۔ وہ اتنی بڑی فوجی قوت جمع کر رہا ہے کہ کل ہمیں اس سے دو چار کر کے ہمارے لئے کوئی راستہ باقی نہ رہنے دے۔ اور اگر خدانخواستہ ہمارے شب و روز اسی طرح رہے تو یہ بات بعید از قیاس نہ سمجھی جائے کہ ہمارے اس وقت کے ذمہ دار حضرات قوم سے صاف کہہ دیں گے کہ جناب اب تو (خدانخواستہ) کچھ نہیں ہو سکتا۔ سچی بات یہ ہے کہ بھارت کے ساتھ ہمارے تعلقات بالکل منقطع ہوں تو یہ بات ہمارے حق میں مفید ہے۔ بھارتی حکمرانوں کو اس فلسفہ کی سمجھ نہیں آئی یا پھر وہ اس کے باوجود مشرقی پاکستان کی طرح ہم پر صرف بزور شمشیر قبضہ کرنے میں ہی اپنی فتح اور ہماری ذلت کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔ ورنہ ہماری مسلمان قیادت بھارت کی ہندو قیادت کے داؤ پیچ کی تاب نہ لا سکتی تھی۔ یہ امر بھی کوئی راز نہیں ہے اور تجربہ بھی اس کی تائید کرتا ہے۔

ادھر ہم ہیں کہ ہماری حکومتوں نے بھارت کی خوشنودی کی خاطر کشمیر کے مسئلہ پر خود پاکستان کو ہی بھارت کے ہاتھ میں یرغمال بنا دیا اور آج تک اس امر کی ضمانت دے رکھی ہے کہ کشمیر کی آزادی کی کوئی تحریک متار کہ جنگ کے اسطرف سے اٹھنے نہیں دی جائے گی۔ بیرون پاکستان بھی ہماری حکومتوں کا بالکل یہی طرز عمل رہا ہے۔ ایک بڑے معروف غیر ملکی صحافی کے بقول "ایک طرف بھارت اپنے تمام تر وسائل بروئے کار لا کر اپنے جھوٹے موقف کو سچا ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے تو دوسری طرف ہماری

طرف سے اپنے سچے موقف کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا جاتا۔ بلکہ کوشش تو یہ رہی ہے کہ ہم کشمیری خود بھی کوئی بات نہ کریں کیونکہ اس سے مزاج بھارت برہم ہو جائے گا۔ ہم تو اس قدر وفا شعار ہیں کہ کشمیر کے سوال پر ہم نے کسی دوست ملک کو بھی اجازت نہیں دی کہ وہ یہ ذکر کرنے کی بے ادبی کا مرتکب ہو۔ یہاں تک کہ وہ تمام سیاسی و غیر سیاسی کانفرنسیں جو سرزمین پاکستان پر منعقد کی جاتی ہیں 'ان میں بھی نہ ہم خود کشمیر کا کوئی ذکر کرتے ہیں نہ کسی دوسرے کو کرنے دیتے ہیں جبکہ ان میں دنیا بھر کے مسائل کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ گویا ہم نے خود ہی اس مسئلہ کو منجمد (Petrify) کرنے کی کوشش کر رکھی ہے۔ لیکن وائے ناکامی اس تمام تر خوشامد کے باوجود بھارت کے تیور نہیں بدلے اور اس کے رویہ میں کوئی لچک پیدا ہوئی نہ نرمی۔

اسی طرح بھارت کی جانب سے آئے دن جو کہا جاتا ہے کہ بھارت کو پاکستان سے خطرہ ہے تو آخر یہ بات ہے کیا؟ بھارت کو پاکستان سے کیا خطرہ ہے اور وہ کیسے ہے؟ بھارت ہم سے ہر لحاظ سے دس گناہ بڑا ہے۔ رقبہ' آبادی' وسائل کس چیز میں بھارت ہم سے کمزور ہے یا ہم اس کے کہیں بھی نزدیک ہیں۔ پھر وہ اب تو ایٹم بم بھی بنا چکا ہے، جو ابھی ہمارے پاس نہیں ہے۔ مشرقی پاکستان میں وہ ہمیں شکست بھی دے چکا ہے۔ اس کی دوست طاقتیں قلبی طور پر اس کے ساتھ اور اس کی ہمدرد ہیں اور وہ بھی دل سے خواہشمند ہیں کہ پاکستان خدانہ کرے 'ختم ہو جائے اور اگر ختم نہیں ہوتا تو کمزور ہی ہو جائے تاکہ طاقت کا توازن ان کے ہاتھ میں ہو۔ ادھر ہمارے دوست ایسے ہیں کہ۔

ع "ہوئے تم دوست جس کے' دشمن اس کا آسمان کیوں ہو"

ہمیں کوئی ملک ایسی امداد نہ کر سکتا ہے نہ کرے گا کہ ہم بھارت پر فوج کشی کرنے کے قابل ہو جائیں۔ امریکہ جو ہمارا دوست ہے وہ بھی پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے۔ جیسے کوئی چور ادھر ادھر دیکھتا ہے کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ بھارت ناراض ہو' یہ بھی نہیں چاہتا کہ پاکستان ختم ہو جائے اور یہ بھی نہیں چاہتا کہ پاکستان اپنے دفاع میں کامل ہو جائے۔ یہ وہ عجیب و غریب دوست ہے، جو ہمیں میسر ہے۔ تو پھر آخر بھارت کی جانب سے یہ سب واویلا کیا ہے؟ اس کی اور کیا توجیہ ہو سکتی ہے کہ منجملہ کئی دوسری باتوں کے وہ ہمارے ساتھ جنگ کی سی کیفیت قائم رکھنا چاہتا ہے تاکہ ہم اقتصادی بوجھ تلے دبتے چلے جائیں۔ قرضے لیکر زندہ رہیں جیسا کہ ہم کر رہے ہیں۔ اس کے دوستوں کو بھی ایک بہانہ مل جائے کہ وہ اس کی امداد جاری رکھیں۔ اور بالآخر اسے اسرائیل کی طرح جس طرح اس نے عراقی تنصیبات کو اڑا دیا' پاکستان پر حملہ کرنے کا جواز میسر آ جائے۔ اس کے سوا بھارت کے اس واویلے میں سر مو بھی کوئی صداقت نہیں ہے۔ بھارت کی جانب سے جب بھی دوستی اور تعلقات کی بہتری کا ذکر ہوا تو اس میں ایک امر ہمیشہ واضح رہا کہ دوستی کا مطلب یہ ہونا چاہئے کہ بھارت اپنی فوجی تیاریاں جاری رکھے' ہمارے خلاف ہر قسم کی کارروائی کا حق اس کے پاس محفوظ رہے اور جو کچھ کہ ہمارے خلاف ان کے منصوبے ہیں وہ بد

چلتے رہیں لیکن پاکستان نہ اپنے دفاع کی تیاری کرے ' نہ اس کا ذکر زبان پر لائے کہ اس کے خلاف بھارت کیا کر رہا ہے اور اس طرح بھارت کا تر نوالہ بننے کیلئے تیار ہو جائے۔ یہ ہے لب لباب اس دوستی کا جو بھارت ہمارے ساتھ کرنا چاہتا ہے۔ یہاں ستم ظریفی یہ ہے کہ ہماری حکومتیں نہ صرف اپنے عوام کو باخبر نہیں کر رہی ہیں بلکہ وہ بھارت کی پردہ پوشی بھی کرتی ہیں کیونکہ ہمارا خدا جو ستار العیوب ہے۔ کیا کہا جائے ہماری اس سیاسی فکر و بصیرت کو؟ اس کا جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ اس کے تفصیلی جائزہ کیلئے تو کم از کم ہزار صفحات کی کتاب کی ضرورت ہے مگر میرے خیال میں یہ ہے اس حقیقی صورت حال کا مختصر خاکہ جس سے ہم اس وقت دو چار ہیں۔ پروردگار ہماری امداد فرمائے۔ آمین

ضمناً یہ معاملہ اگرچہ بھارت کے ساتھ تعلقات کے بارے میں ہے مگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ہماری قومی کیا بین الاقوامی یا خارجہ پالیسی پوری کی پوری بالکل اسی نوعیت کی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے تجزیئے سے یوں دکھائی دیتا ہے جیسے ہم اندر سے باہر کی جانب نہیں بلکہ باہر سے اندر کی طرف کام کرنے کی کوشش میں ہیں۔ علاوہ اس کے کہ قومی پالیسی مرتب کرنے میں متعلقہ افراد کا علم ' یقین ' تجربہ 'بصیرت اور عزائم ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ امر بھی اتنا ہی اہم ہے کہ ہماری جو بھی پالیسی ہو گی اس کے مؤثر ہونے یا نہ ہونے کا دارومدار بلا استثناء ہمارے داخلی حالات پر ہو گا۔ یعنی اگر اندر حالات درست ہوں گے تو باہر اس کا اثر بہتر ہو گا۔ ورنہ اس کے برعکس۔ اگر بنیادی اصول پر دیکھا جائے تو ہمارے ہاں کیفیت بالکل برعکس ہے۔ ہمارے ہاں متعلقہ لوگوں کی کوشش یہ دکھائی دیتی ہے کہ باہر کی مدد سے اندرونی حالات بھی درست کئے جائیں۔ جس کا مطلب گاڑی کو گھوڑے کو آگے باندھنا ہے اور معلوم ہے کہ وہ گاڑی کبھی نہیں چلے گی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے جو ہو رہا ہے۔ نہ اندر کے حالات درست ہیں 'نہ باہر کے۔ یہ بھی اب کوئی راز نہیں رہا کہ ہمارے اندرونی معاملات میں بیرونی مداخلت کس طرح روز بروز بڑھ رہی ہے اور کتنی گہری ہوتی جا رہی ہے بلکہ اس سے بڑھ کر المیہ یہ ہو رہا ہے کہ حکومت کے اس طرز عمل سے سیاسی فکر بھی بری طرح متاثر ہو رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض سیاسی جماعتیں اور کئی سیاسی رہنما بھی اب ملک سے باہر ہی دیکھ رہے ہیں۔ طرہ یہ کہ اس کو باعث افتخار سمجھا جا رہا ہے۔ جبکہ یہی امر باعث عار ہونا چاہئے تھا۔ ہماری اس کمزوری کا فائدہ اٹھانے میں بھی بھارت نے کسر نہیں اٹھا رکھی۔ قطع نظر اس کے کہ کوئی دوسرا بڑا یا چھوٹا ملک اس سے کیا استفادہ کرتا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری اسی پالیسی کا نتیجہ ہے کہ بعض وہ چھوٹے ممالک جن کے اہم معاملات کا انحصار ہی ہم پر ہے، وہ بھی ہمیں حقیر سمجھنے لگے ہیں۔ ان کے ہاں ہماری حکومت کا کوئی احترام ہے نہ عوام کا۔ صرف ان کی حکومتیں ہی ایسا نہیں کرتیں بلکہ ان کے عوام بھی پاکستانیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ کی عطا کردہ بے پناہ صلاحیتوں کی مالک اس قوم کا یہ حشر دیکھ کر افسوس اور حسرت کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے۔ شاید

پرورد گار کسی وقت کچھ ایسے لوگ پیدا کر دے جوان صلاحیتوں کو بروئے کار لاسکیں اور اس قوم کو ذلت اور رسوائی کے اس گڑھے سے نکال سکیں۔ اس تاریخی عمل کا کوئی علاج نہیں ہے کہ قومیں خود بخود کچھ نہیں ہوتی وہ اپنے عقائد اور رہنماؤں کی محتاج ہوتی ہیں۔ ایک شخص کے ہونے یا نہ ہونے سے پوری تاریخ متاثر ہو جاتی ہے۔ ورنہ اس قوم میں وہ تمام صلاحیتیں بدرجۂ کمال موجود ہیں جو اس کو دنیا کی ممتاز ترین قوموں کی صف اول میں کھڑا کر سکتی ہیں۔ غالباً بات یہی ہے کہ۔

ع "آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست"

مسئلہ کشمیر کا واحد حل ـــــ کشمیر بنے گا پاکستان

کشمیر کی خود مختاری کی یہ تحریک اگر مقبوضہ کشمیر میں چل رہی ہوتی تو پھر اس کے کچھ نہ کچھ معانی سمجھ میں آسکتے تھے۔ لیکن اس طرف تو پاکستان کے ساتھ الحاق کی تحریک چل رہی ہے۔ مگر حد متار کہ کے اس طرف آزاد کشمیر میں ایک مخصوص گروہ خود مختاری کی تحریک چلا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ریاست کا بڑا حصہ تو بھارت کے قبضہ میں ہے۔ اس کو آزاد کروائے بغیر ظاہر ہے کہ کسی خود مختاری کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا اور اس کو آزاد کروانے کیلئے کشمیری مسلمان اس وقت تک کچھ بھی نہیں کر سکتا ما سوائے محض دفاعی نوعیت کی تحریک کے، جب تک آزاد کشمیر میں سے کوئی تحریک شروع نہ ہو اور آزاد کشمیر کو اس تحریک کا بیس کیمپ نہ بنایا جائے۔ یہاں یہ نکتہ بتانا ضروری ہے کہ بعض ناسمجھ حضرات اور کچھ منچلے لوگ اصرار کرتے ہیں کہ صاحب مقبوضہ کشمیر کے لوگ کیوں نہیں خود لڑ کر آزادی حاصل کر لیتے۔ تو میں یہ کہتا ہوں کہ دنیا کی کوئی بھی اس قسم کی تحریک دو بنیادی باتوں کے بغیر نہیں چل سکتی نہ چلتی ہے۔ وہ یہ کہ متاثرہ علاقہ کے باہر ایک محفوظ جگہ مہیا ہو جس کو بیس کیمپ بنایا جائے اور دوسرے یہ کہ حریت پسندوں کو ہر قسم کی بھرپور امداد مہیا ہو۔ کشمیر کے ضمن میں بدقسمتی سے یہ دونوں باتیں موجود نہیں۔ آزاد کشمیر میں بیس کیمپ ہو سکتا تھا مگر اس کو اس وقت تک متحرک نہیں کیا جا سکتا جب تک پاکستان خود بھارتی حملہ سے محفوظ نہ ہو جائے تاکہ وہ بھارت کی جوابی کارروائی کا متحمل ہو سکے اور یہ دونوں باتیں محض بچوں کا کھیل نہیں ہیں اور نہ اس کو محض خیالی اور تصوراتی مفروضوں کی بناء پر فرض کر لیا جا سکتا ہے جیسے بعض بچے آج کل ٹیلیویژن پر "جی۔ ایم۔ ڈی۔ ایم" (GM. DM) دیکھ کر صوفے پر چھلانگیں لگاتے ہیں اور بلا مقصد ہاتھ پاؤں زخمی کر لیتے ہیں۔

نہ رہے بانس نہ بجے بانسری

یہ بالکل ایک علیحدہ موضوع ہے کہ آیا آزاد کشمیر کو بیس کیمپ بنایا جاسکتا ہے یا نہیں؟اس کے جواب میں مختلف آرا ہیں‘مگر میرے نزدیک یہ بات بالکل ممکن ہے۔ ہاں اس میں خطرات ضرور ہیں اور ایسا کوئی بھی کام خطرات سے خالی نہیں ہو سکتا البتہ اس میں ایسے خطرات نہیں جو بعید از قیاس ہوں۔ اگر اس تحریک والوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم صرف پراپیگنڈہ کرتے رہیں اور اس طرح کسی وقت بھارت مجبور ہو کر کہے گا ''اچھا بھائی تم بہت دیر سے شور کر رہے ہو۔ اس لئے ہم کشمیر پر اپنا تسلط ختم کرتے ہیں'' تو اس سے بڑھ کر مضحکہ خیز اور طفلانہ خیالی کیا ہو سکتی ہے اور جب تک بھارت والے خود یا ہمارے کسی دباؤ کی وجہ سے مجبور نہیں ہو جاتے کہ وہ بھی اس فکر پر رضامند ہوں اور کشمیر سے دستبردار ہو جائیں تو اس تحریک کا کوئی جائز مقصد سمجھ میں نہیں آتا۔ ہاں اس کا یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ بھارتی تسلط کے بارے میں ہم خوش فہمی میں رہیں اور یکطرفہ طور پر آزاد کشمیر کو خود مختار کرلیں تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری!

اس سادگی پر کون نہ مر جائے

مجھے آج تک یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ جب بھارت پر ہم اپنی پہلی محفوظ اور مسلمہ حیثیت میں دباؤ نہیں ڈال سکے جس میں ایک بڑا ملک پاکستان بھی خود ایک فریق ہے اور اس نزاع کے باعث بھارت کا عظیم نقصان ہو رہا ہے۔ تو ہم اس موقف سے ہٹ کر ایک کمزور موقف اختیار کر کے کیا دباؤ ڈال سکیں گے اور کیسے؟۔ اس پہلو پر بھی غور کیجئے تو صاف ظاہر ہو گا کہ یہ سوچ نہ صرف مقبوضہ کشمیر کی آزادی کے خلاف ہے بلکہ خود آزاد کشمیر کو بھارت کے حوالے کرنے کی ایک غیر ملکی سازش ہے۔ چونکہ ہمارے دشمنوں کے نزدیک پاکستان کو کمزور کرنے کا یہ واحد راستہ ہے۔ پھر تماشہ یہ کہ یہ لوگ مطالبہ کرتے ہیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ حکومت پاکستان اور پاکستان کے لوگ بھی کشمیر کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر تبدیل کریں، ہمارا ساتھ دیں اور وہ تمام خطرات بھی مول لیں اور ان کا مقابلہ بھی کریں جو اس راہ میں موجود ہیں یعنی جو خطرات ان کو تکمیل پاکستان کیلئے مول لینے چاہئیں تھے‘ ان سے زائد خطرات پاکستان کی سلامتی کے خلاف مول لے لیں۔ پاکستان کی وہ حکومت اور لوگ بھی تاریخ میں بہت خوب ہوں گے اور یقیناً کسی نمائش میں رکھے جانے کے قابل ہوں گے جو اس قسم کی حرکت کریں گے یعنی اسی شاخ کو کاٹیں جس پر وہ بیٹھے ہوں! میں نے شیخ چلّی کے ان ساتھیوں سے کئی بار کہا کہ بھارت سے اس حصہ یعنی مقبوضہ کشمیر کو آزاد کروا کے خود مختار کرا دو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس حصہ یعنی آزاد کشمیر کو میں پاکستان والوں کی منت سماجت کروا کے اسے تمہارے خود مختار کشمیر کے ساتھ شامل کر دوں گا۔ تو اس

کے جواب میں وہ فرماتے ہیں کہ نہیں یہ کام بھی تم اور پاکستان والے مل کر سرانجام دو۔ ہم تو صرف راہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ صحیح راستہ ہے۔ اس "سادگی" پر کون قربان نہ ہو گا۔

کشمیر بنے گا پاکستان

ایک اور مفروضہ بھی اکثر زیر بحث آتا ہے کہ کشمیر خود مختار ہو کر قائم بھی رہ سکتا ہے یا نہیں؟اس پر بحث ہو سکتی ہے۔ بعض لوگ کئی دوسری چھوٹی مملکتوں کے حوالے دیتے ہیں کہ وہ جو قائم ہیں' یہ کیوں نہیں ہو سکتا وغیرہ وغیرہ ۔ ۔ ۔ ۔ جس کو خدا نے معمولی سی سیاسی عقل بخشی ہے' وہ یہ سمجھتا ہے کہ ریاست جموں و کشمیر جس کی افغانستان کے ذریعے روس کی سرحدیں قریب ہیں کی یہ مفروضہ خود مختاری بھی صرف اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے کہ چین 'بھارت' پاکستان مل کر اس کی ضمانت دیں کہ وہ مستقل طور پر اس کی خود مختاری کی حفاظت کریں گے کیونکہ نہ صرف ان اشتراکی ملکوں کی سرحدات ہی کشمیر سے ملتی ہیں بلکہ دو بڑی ہمسایہ مملکتوں بھارت اور پاکستان کیلئے بھی یہ خطہ زمین بے پناہ اہمیت رکھتا ہے اور کسی بھی اعتبار سے یہ صرف ان دو میں سے ایک کا جزو ہو سکتا ہے۔ نہ کشمیر ان دو کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے 'نہ یہ اس کے بغیر پوری طرح محفوظ و مطمئن ہیں۔ ورنہ یہ جھگڑا کب کا ختم ہو جاتا۔ عوامی جمہوریہ چین کی وجہ سے اس خطہ کی اہمیت روس کے نزدیک بھی بہت اہم ہے اور امریکہ بھی اپنی ایشیائی پالیسی میں بہت حد تک بھارت کی وجہ سے بھی اس خطہ سے دلچسپی رکھتا ہے۔ تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایسی کون سے بڑی طاقت ہے جس کے عالمی مفادات کی خاطر اس خوفناک چکر میں ہم خود کو ڈال دیں۔ البتہ اگر اس کو چین کا کشمیر بنانا مقصود ہے یا بھارت کے رحم و کرم پر زندہ رکھنے کا ارادہ ہے تو وہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے لیکن اگر اس کو اسلام کا کشمیر رکھنا ہے'مسلم کشمیر بنانا ہے تو اس کا کوئی دوسرا راستہ دریافت کرنا ہو گا اور وہ صرف اور صرف وہی ہے جو ریاستی مسلمانوں نے ابتداء ہی سے اختیار کر رکھا ہے۔ یعنی "کشمیر بنے گا پاکستان"۔

خود مختاری کا فریب

جہاں تک ریاستی مسلمانوں کا تعلق ہے۔ تو یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ متارکہ جنگ کے دونوں طرف کے عوام اور خواص میں سے کوئی قابل ذکر فرد یا جماعت ریاست کی پاکستان سے علیحدگی اور خود مختاری کو ابھی تک قبول نہ کر سکی نہ آئندہ کرے گی۔ آزاد کشمیر میں تو سرے سے اس کا اثر ہی نہیں ہے۔ سوائے چند افراد کے جو محض ایک فرد کی ذات کی وجہ سے ناسمجھی کے باعث اس میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ باقی لوگ خدا کے فضل و کرم سے اسلام اور پاکستان پر کوئی سودا کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ مقبوضہ کشمیر کا ذکر

میں کافی کر آیا ہوں۔ وہاں نظریۂ پاکستان کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ جو چند لوگ آزاد کشمیر میں اس فکر سے متاثر ہیں ان کی اکثریت بھی ایسے حضرات پر مشتمل ہے جن کو یہ بتایا جاتا ہے کہ صاحب! ہم تو حکومت پاکستان کی بد سلوکی کی وجہ سے ایسا کہہ رہے ہیں تاکہ وہ درست ہو جائیں ورنہ دل سے تو ہم بھی وہی ہیں۔ آخر کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟ اس کے برعکس اگران کو یہ بھی بتایا جائے کہ ہم تو خود حکومت پاکستان کے ایماء پر ایسا کرتے ہیں تو اس طرح ہمارے کئی سادہ لوح حضرات اس فریب کا شکار ہیں۔ جوں جوں حقیقتوں سے پردہ اٹھتا ہے وہ اپنی راہ درست کرتے رہتے ہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ ایسی حالت میں کشمیر کو خود مختار کرے گا کون؟۔

اگر یہ تجویز کسی وقت بھارت کی طرف سے پیش کی جائے تو پھر بھی اس قابل ہے کہ اس پر بات کی جا سکے، لیکن ہماری طرف سے اس تجویز کا پیش کرنا ناقابل فہم ہے۔ یہ تجویز محض فکری انتشار اور پسپائی کی علامت کے سوا اور کیا ہے؟ یا یہ کہ اس سے ایسا فکری انتشار پیدا کرنا مقصود ہے جس سے خود اہل کشمیر آپس میں الجھ کر رہ جائیں اور دست و گریباں ہوں تاکہ بقیہ کشمیر کی آزادی کا خیال ہی نہ رہے اور یہ کہ پاکستان اور کشمیر میں جو وحدت ہے، وہ بھی پارہ پارہ ہو جائے۔ اس میں مفاد کس کا ہے، ایک طفل مکتب بھی بخوبی سمجھتا ہے۔

نظریہ خود مختاری کے خطرناک اثرات

اب اس کا وہ پہلو ذرا ملاحظہ فرمایئے جو اس تحریک کو متارکۂ جنگ کے اس طرف چلانے سے متعلق ہے اور جس کا اطلاق فوری طور پر ہوتا ہے یعنی قبل اس کے یہ تحریک مؤثر طریقہ سے چلے اور اپنے ظاہری مقصد کو پہنچے، اس اثناء میں ہمارا کیا حشر ہوتا ہے اور کیا ہم اپنی قومی زندگی کے ساتھ یہ خطرناک کھیل کھیل بھی سکتے ہیں یا نہیں؟ میرے نزدیک اس کی اہمیت دوسرے معاملات سے زیادہ ہے۔ جب ہم پورے کشمیر کی خود مختاری کی بات صرف متارکۂ جنگ کے اس طرف کرتے ہیں تو یہ کہے بغیر ہی اس کا صحیح مفہوم یہ بنتا ہے کہ ہم ایک تو اپنے پہلے مقصد سے منحرف ہو جائیں اور یہ ثابت کریں کہ ہمارے پیشرو سب بیوقوف تھے اور اب تک جو کچھ ہوا سب غلط تھا اور جو بے شمار قربانیاں دی گئیں، سب بے مقصد تھیں اور جن شہداء نے قربانیاں دیں، جن لوگوں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور جن لوگوں نے گھر بار چھوڑ دیئے وہ سب غلطی پر تھے۔ پھر ہم بھارت کو موقع دیں کہ وہ کہے "صاحب! ان کا دعویٰ شروع ہی سے غلط تھا" اور ظاہر ہے کہ جس قوم کو اتنے سال بعد عقل آئی، کیا عجب ہے کہ کچھ دیر بعد مزید عقل آئے اور یہ لوگ بھارتی تسلط کو جائز تصور کرنے لگیں۔

دوسرا خطرناک پہلو اس کا یہ ہے کہ اس تحریک کے نام سے ہی ملت واحدہ کا تصور مٹ جاتا ہے یعنی ہم میں سے کوئی شخص یہ کہے یا سوچے کہ وہ اپنی ایک علیحدہ خود مختار مملکت بنانا چاہتا ہے تو اس سے فوری طور پر جو فکری اور ذہنی رد عمل ہوتا ہے وہ پاکستان اور اس کے عوام کے ساتھ غیریت کا احساس ہے، یعنی ہم لوگ دو علیحدہ قوموں اور ملکوں کے باشندے ہیں اور یہ اس تحریک کا پہلا کڑوا پھل ہے۔ اس تحریک سے ایک اور سب سے بڑا زہر آلودہ تیر جو اس قوم کے سینے میں پیوست ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی کہے ایسا نہیں ہے تو وہ جھوٹا ہے اور منافقت کر رہا ہے یا دانستہ دھوکہ دینا چاہتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہمارے درمیان ایک قوم کا تصوّر دیر سے قائم ہے اور جس کو اس دور میں اور زیادہ مضبوط ہونا چاہئے 'وہ کمزور کیا' ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے اور جوں جوں یہ فکر آگے بڑھے گی' یہ نفرت میں تبدیل ہوتی جائے گی۔ چنانچہ بالآخر معلوم ہو گا کہ اس تحریک کی عمارت در حقیقت ہم نے محض باہم نفرت پر رکھی تھی۔ اسی پر اکتفاء نہیں' ہم یہ بھی چاہیں گے کہ ہم تو پاکستان اور اہل پاکستان سے علیحدگی پر پورا زور دیں اور تمام دلائل سے لوگوں کو قائل کریں کہ ہم نہ تو بھارتی ہندوؤں کے ساتھ رہ سکتے ہیں کیونکہ وہ کشمیر میں جارحیت کے مرتکب ہوتے ہیں جیسا کہ اس تحریک والوں کی جانب سے اکثر کہا جاتا ہے 'اور نہ پاکستانی مسلمانوں کے ساتھ رہ سکتے ہیں کیونکہ ہمیں علیحدگی میں مزا آتا ہے۔ اس تھیوری سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اہل پاکستان نہ صرف ہماری محبت کا دم بھرتے رہیں بلکہ ہماری بھرپور امداد بھی کریں اور خود پاکستان کو بھی ہماری اس نفرت انگیز تحریک کی کامیابی کی خاطر مسلسل داؤ پر لگا کر رکھیں مگر ہم اس کے بھائی بننے کیلئے تیار نہ ہوں۔ سبحان اللہ۔ ۔ ۔ اس سے "نرالی" فکر اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس وقت تک اس تحریک کے ضمن میں جو ہو رہا ہے' وہ حرف بحرف یہی ہے۔ اس میں کوئی بات غلط نہیں ہے۔

کاشر دیش اور خود مختار کشمیر کا احمقانہ اور غیر اسلامی تصور

اسی تحریک کے بڑھاوے کی خاطر کشمیریوں کی علیحدہ قومیت پر بھی زور دیا جاتا ہے اور "کاشر دیش" کے فریب آمیز احمقانہ نعرے لگائے جاتے ہیں اور کسی کو کیا معلوم کہ پاکستان کو کمزور کرنے کیلئے جو تحریکیں چل رہی ہیں وہ کس طرح ان مختلف قومیتوں کے تعصبات کو پیدا کرنے اور ہوا دینے پر لگی ہوئی ہیں؟۔ اسی تحریک کا ایک یہ ثمر تھا کہ "آزاد کشمیر کو تسلیم کروانے" کی تحریک چلی۔ اس تحریک کے ذمہ دار بعض سرکاری حلقے بھی تھے۔ یہ تحریک اصل تحریک کا' بالکل منطقی نتیجہ تھی کیونکہ جب آزاد کشمیر میں یا پاکستان میں بیٹھا ہوا شخص کشمیریوں کی خود مختاری کی بات کرے تو لامحالہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی ابتداء آزاد کشمیر سے ہی ہونا چاہئے۔ تب ہی تو اس تحریک کے بارے میں صحیح بات سمجھ میں آ سکتی ہے۔ چنانچہ ایک وقت ایسا آیا کہ اس تحریک کو بھی فکری فضا میسر آ گئی۔ مسٹر کے۔ ایچ۔ خورشید کو جب مرحوم

ایوب خان نے اپنی آمریت کے دور میں آزاد کشمیر کا صدر بنایا تو جلد ہی اس تحریک کا آغاز ہو گیا۔ سابق وزیر خارجہ پاکستان منظور قادر مرحوم کی سیکولر فکر نے اس تحریک کو مزید ایڑھ لگائی اور یہ کام نہ معلوم کیسے ہوتے ہوئے رک گیا۔

غالباً دو یا تین باتیں آڑے آ گئیں۔ ایک تو رئیس الاحرار قائد ملت چودھری غلام عباس مرحوم کی زبردست قوتِ فکر جس سے انہوں نے تحریک کی مخالفت کی، جس وجہ سے محبّ وطن پاکستانی ایک لمحہ کیلئے سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ کہیں اس تحریک میں کوئی خرابی تو نہیں ہے؟ خود ایوب خان مرحوم نے بھی مزید غور کرنا شروع کر دیا کیونکہ یہ بات ہر شخص کو معلوم تھی کہ چودھری صاحب کسی ذاتی غرض سے تو ایسا کر نہیں رہے تھے۔ وہ خالصتاً قومی بلکہ پاکستان کے مفاد میں بات کرتے تھے۔ جس کا ان کے مخالفین کو بھی اعتراف تھا۔ ان کے ارشاد کے مطابق مسلم کانفرنس نے اس تحریک کے خلاف زبردست مہم چلا دی تھی۔ قائد مرحوم اور ان کے ساتھیوں کیلئے بہت بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ اس کا آج تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ کہتے تھے کہ پاکستان کا مفاد متاثر ہو رہا ہے اور حکومت پاکستان نہ صرف اپنے ہاتھ سے اپنی جڑیں کاٹ رہی تھی بلکہ نوکر شاہی کے چند پرزے قائد مرحوم اور ان کے ساتھیوں کو "غدار" اور "ملک دشمن" سمجھتے تھے۔ جس کا ثبوت اس وقت کے وزیر خارجہ مسٹر منظور قادر کے اخباری بیانات ہیں۔ دوسری رکاوٹ بھارت کے اس وقت کے وزیر خارجہ کا وہ بیان تھا کہ اگر آزاد کشمیر کو خود مختار تسلیم کیا گیا تو بھارت اس پر حملہ کر دے گا۔ اس نے پہلی بار حکومت پاکستان اور محبّ وطن لوگوں کی آنکھیں کھولیں اور انہیں چودھری صاحب مرحوم کی سیاسی بصیرت کا اندازہ لگا اور تیسری رکاوٹ غالباً یہ ہو گی کہ ابھی جبکہ آزاد کشمیر کو خود مختار کرنے کی صرف بات ہی ہو رہی تھی تو جیسا کہ کئی ارباب اختیار نے بعد میں صاف صاف کہا، آزاد کشمیر کے اس وقت کے صدر کا طرز عمل ایک علیحدہ ملک کے خود مختار حکمران کا سا ہونا شروع ہو گیا تھا جس سے ان حضرات کی اپنی فکر کے بارے میں اور جو کچھ محبّ وطن کشمیریوں کی طرف سے ان کو بتایا جاتا تھا غلط فہمیاں بھی دور ہونے لگیں۔ پہلے پہل حکومت کا یہ قابل رحم خیال تھا کہ یہ خود مختاری محض دکھاوے کیلئے ہو گی، باقی معاملات اسی طرح رہیں گے۔ لیکن جلد ہی معلوم ہوا کہ اس وقت کے صدر آزاد کشمیر سے جو کچھ بتایا جا رہا تھا وہ یا تو محض فریب تھا یا سرے سے ناممکن تھا اور وہ جو کچھ سمجھ رہے تھے وہ سوائے حماقت کے کچھ بھی نہ تھا۔ یہ بھی ان کی ایک بات تھی جو ہم اس فکر کے خلاف بطور دلیل بیان کرتے تھے یعنی ایک دلیل تو ان حضرات کی طرف سے یہ دی جاتی کہ صاحب، ہم آخر مسلمان ہی تو ہیں۔ خود مختار ہو کر کہاں جائیں گے ؟ یہ تو محض دنیا کے دکھاوے کیلئے ہے۔ یہ دلیل کتنی نیک نیتی یا سادگی پر مبنی کیوں نہ ہو، ہم یہ کہتے تھے کہ یہ بات دوسروں کو نہیں، خود اپنے آپ کو دھوکہ دینے والی ہے۔ فرضی خود مختاری کو کوئی تسلیم نہیں کرے گا اور صحیح خود مختاری ہماری اصل تحریک کا رخ ہی سرے سے موڑ دے گی

اور اپنے ہی گھر میں تباہی کا باعث بن جائے گی اور کوئی ذی عقل شخص چھری کے محض سونے سے بنی ہوئی ہونے کے باعث اپنے سینہ میں نہیں گھونپتا۔

ان دونوں تحریکوں یعنی خود مختاری اور آزاد کشمیر کو تسلیم کرانے والی تحریکوں کو اسی لئے ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں دیکھا جاسکتا' ان کو یکجا کر کے ہی دیکھنا ہو گا بلکہ جیسا کہ آگے چل کر ان کے عملی پہلوؤں سے معلوم ہو گا یعنی یہ دوسری تحریک یعنی آزاد کشمیر کو تسلیم کراؤ کی تحریک اس اصل تحریک کا اگرچہ ایک جزو ہے لیکن اس سے زیادہ خطرناک ہے۔

قومی اور بین الاقوامی سطح پر تحریک خود مختاری کے نتائج

کشمیر کی خود مختاری کی تحریک کے چلنے کے دو ہی راستے ممکن ہیں ایک تو یہ کہ حکومت پاکستان اس کا ساتھ دے اور دوسرا یہ کہ حکومت پاکستان کی مخالفت کے باوجود اس کو چلایا جائے۔ کوئی تیسری صورت ممکن نہیں ہے۔ اگر یہ تحریک پاکستان کے مفاد میں ہے یا کم از کم پاکستان کے مفاد سے متصادم نہیں ہے تو پھر حکومت پاکستان کو چاہئے کہ وہ اس کا ساتھ دے یا کم از کم وہ اس سے چشم پوشی کرے' یہ بھی ایک ساتھ دینے کی ایک صورت ہے۔ ورنہ اگر یہ صورت پاکستان کے مفادات کے خلاف ہے تو اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے کہ حکومت پاکستان اس کی مخالفت کرے اور ظاہر ہے کہ اور آگے چل کر یہی کرنا ہو گا۔ مزید گزارش کروں گا کہ یہ تحریک کسی اور کے مفاد میں ہے یا نہیں' پاکستان کے مفاد میں تو ہرگز نہیں بلکہ سراسر نقصان میں ہے اِس میں پاکستان کی سلامتی کیلئے مشرقی پاکستان سے بھی کئی گنا زیادہ بڑا خطرہ ہے۔ پاکستان کی کوئی بھی حکومت ہوش میں ہوتے ہوئے اس تحریک کی حمایت کر سکتی ہے نہ اس سے چشم پوشی' تو ظاہر ہے کہ اگر ایسی صورت میں یہ تحریک چلائی جائے گی تو اس کا پہلا ٹکراؤ ہی حکومت پاکستان سے ہو گا اور جوں جوں یہ ٹکراؤ زیادہ ہو گا' اس تحریک کا رخ بھارت کی مخالفت کے بجائے خود پاکستان کے خلاف ہوتا جائے گا۔ تو اس طرح پھر باقی کیا رہ جاتا ہے اور اس وقت اس تحریک کے کارکنوں کا طرز عمل بھی بالکل یہی ہے۔ یوں بھی جب کہا جائے کہ کشمیر میں بھارت اور پاکستان دونوں کے خلاف نفرت اور مخالفت پیدا ہوئی ہے' خواہ وہ مقصود ہو یا نہ ہو' تو کیا ایسی تحریک جس کی بنیاد پاکستان کے خلاف نفرت اور دشمنی پر ہو یا منافقت پر ہو' اس میں شرکت کی جا سکتی ہے؟ اور کیا ایسی تحریک مسلمانان ریاست کیلئے کسی قسم کے مفاد کی حامل ہو سکتی ہے؟ اور پھر اسلام کے ساتھ اس کا کیا رشتہ باقی رہ جاتا ہے؟ اسی فکر کا نتیجہ تھا کہ آزاد کشمیر کی صدارت کے دوران خورشید صاحب کے زمانہ میں خود آزاد کشمیر کے اندر جہاد آزادی کے خلاف عام جلسوں میں تقریریں ہوتی رہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی ایک کیا ہزاروں باتیں سرزد ہونا محض منطقی

نتیجہ ہے اس فکر کا، تو اس تحریک کا پہلا قدم یہیں سے شروع ہوتا ہے۔

اسی طرح جب خود مختار ریاست کی حیثیت سے آزاد کشمیر کے بین الاقوامی طور پر تسلیم کئے جانے کی تحریک کی بات کی جائے تو سب سے پہلے یہ کڑوی گولی پاکستان کو ہی نگلنا پڑے گی اور پاکستان کے انکار کی صورت میں تصادم کا شدید خطرہ ہو گا۔ تو پھر اس کی کیا صورت ہو گی؟ واضح رہے کہ اگر اس کے باوجود ہم اس تحریک پر اصرار کریں تو پھر یہ جنگ حکومت پاکستان کے خلاف ہو گی۔ تو کیا یہ بات تحریک آزادی کشمیر میں مدد گار ثابت ہو گی یا ضرر رساں؟ تو کیا ایسی صورت میں اس سے ہماری تحریک آزادی و خود مختاری کا رخ سری نگر کی جانب ہو گا یا اسلام آباد کی جانب؟ اور اسلام آباد سے نکل کر پھر واشنگٹن، پیکنگ اور ماسکو کی طرف؟ اگر فی الواقع سری نگر سے توجہ ہٹانا مقصود نہ بھی ہو تب بھی ایسا ہو جائے گا اور جب خدانخواستہ ایسا ہو جائے تو پھر نقار خانے میں کس کی سنائی دیتی ہے جو ہماری سنائی دے گی۔ جب یہ تحریک اس حالت میں یعنی پاکستان کی مخالفت کی صورت میں خود پاکستان میں چلائی جائے گی تو اس کے کارکنوں کے بارے میں پاکستانی مسلمانوں کی رائے کیا ہو گی؟ عوام الناس کی رائے اس لئے ضروری ہے کہ پاکستان کی حکومتیں کشمیر کیلئے جو کریں گی سو کریں گی، مگر پاکستانی عوام نے کشمیر کیلئے کشمیریوں کے شانہ بشانہ قربانیاں دی ہیں اور وہی مستقبل میں بھی ہماری امید ہیں بلکہ ان کی اخلاقی اور مادی امداد کے بغیر کشمیر میں کوئی تحریک نہیں چل سکتی۔ تو ظاہر ہے جب ہم ان کے خلاف تحریک چلائیں گے تو پھر ہمیں ان کی ہمدردیاں کس طرح حاصل ہوں گی؟ یہ وہ مسئلہ ہے جس کو ہماری سمجھ تو نہیں حل کر سکی۔

پاکستان میں مقیم کشمیری مہاجرین کا مستقبل

اس کے ساتھ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ پاکستان میں مقیم کئی لاکھ مہاجرین جموں و کشمیر کا اس تحریک کے بارے میں کیا ردِ عمل ہونا چاہئے؟ یعنی اگر وہ اس تحریک کا ساتھ دیں تو کیا پاکستان میں بیٹھ کر ان کا ایسی تحریک چلانا جس کی بنیادیں خود پاکستان سے نفرت پر رکھی گئی ہوں، اخلاقی، سماجی اور اقتصادی لحاظ سے درست ہو گا؟ اور کیا ان کی حیثیت اپنے ہی گھر میں ایک مجرم جیسی نہ ہو جائے گی؟ اور کیا ان کی وہ عزت و آبرو اور محبت جو اہل پاکستان کے دلوں میں رہی ہے، وہ قائم رہے گی؟ اور کیا وہ سر اونچا کر کے چل سکیں گے؟ اور کیا ان کی بے پناہ قربانیوں کا یہی انجام تھا جو انہوں نے ۱۹۴۷ء کے قتل عام کے دوران دو لاکھ سے زائد فرزندان توحید کو قربان کر کے دی تھیں؟ کیا مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر کے لاکھوں افراد پاکستان میں جہاں وہ اپنا ملک اور گھر سمجھ کر بس رہے ہیں، غیر ملکی نہ کہلائیں گے؟۔ اور کیا ان کی غیرت گوارا کرے گی کہ وہ اپنے ہی ملک میں غیر ملکی کہلانا پسند کریں۔ بفرض محال یہ تحریک جب آزاد کشمیر میں

چلے گی (اور انشاءاللہ کبھی نہیں چلے گی) تو کیا آزاد کشمیر کے لوگوں کا پاکستان میں وہی مقام ہو گا جو اب ہے؟ اور کیا ان کا استحقاق وہی رہے گا جو انہیں اب پاکستان میں حاصل ہے۔ جب آزاد کشمیر کے لوگوں میں یہ صورت حال پیدا ہو جائے تو پاکستان کی حکومت کا ردعمل کیا ہو گا اور کیا ہونا چاہئے؟ کیا وہ مراعات جن کے باعث آزاد کشمیر زندہ ہے' باقی رہیں گی؟ ان لاکھوں افراد کا کیا ہو گا جو پاکستانی فوج اور دیگر اداروں میں ہیں اور اہم اور بڑے عہدوں پر فائز ہیں؟ کیا کسی بھی اعتبار سے یہ جائز ہو گا کہ وہ ایک دوسرے ملک میں جس کے وہ مفادات کے خلاف ہوں' اس کی فوج اور انتظامیہ کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ سکیں؟ اور اگر نہیں رہ سکیں گے تو کیا آزاد کشمیر ان کے مفادات کے تحفظ کا متحمل ہو سکے گا۔ کیا آزاد کشمیر کا تاجر اور کاروباری پاکستان میں ایک غیر ملکی کی حیثیت سے کام کرنا پسند کرے گا؟ پھر اس پر اہل پاکستان کا کیا ردِّعمل ہو گا؟۔ اور اگر وہ بھی مخالفانہ ہو تو پھر خود آزاد کشمیر ہی کیسے باقی رہے گا؟ کیا اس صورت میں بھارت سے حفاظت کی بھیک مانگنا پڑے گی؟ (عیاذ نا باللہ) 'تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ کشمیر کی آزادی یا آزاد کشمیر کی غلامی؟۔

بنگلہ دیش سے زیادہ خطرناک تحریک

آزاد کشمیر پاکستان کی سب سے اہم دفاعی سرحد ہے۔ اس میں نہ صرف پاکستان کو اپنی فوج ہی رکھنا پڑ رہی ہے بلکہ خود آزاد کشمیر کے کئی لاکھ بہادر اور جنگجو لوگوں میں سے بے شمار لوگ خود اسی فوج میں شامل ہیں جو اپنی فوج کے شانہ بشانہ دشمن کے مدمقابل ہیں۔ ان کے اوپر سے گذر کر ہی بھارتی افواج پاکستان کی سرحد میں داخل ہو سکتی ہیں؟ اور سب کو معلوم ہے کہ اگر یہ کوئی آسان کام ہوتا تو بھارت ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں دوسرے محاذ تلاش نہ کرتا۔ تو کیا اس دفاعی سرحد کے اندر پاکستان کے خلاف نفرت اور اس کے خلاف علیحدگی کی تحریک کا اجراء بالکل جائز سمجھا جا سکتا ہے؟ اور اس کی کبھی بھی اجازت دی جا سکتی ہے؟ بالکل اسی طرح کہ جیسے میں نے پہلے بھی کہا تھا' آزاد کشمیر کو تسلیم کراؤ' کے پردے میں بھارتی وزیر خارجہ نے آزاد کشمیر پر حملہ کرنے کی دھمکی دے دی تھی۔ تو ان حالات میں اگر وہ فی الواقع حملہ کرنا چاہے تو اس کو کون روک سکے گا؟ اس کی کیا ضمانت ہے؟ اور اگر وہ حملہ کرے تو کیا یہ سیاسی مسخرہ پن اس حملے کے سامنے ڈھال بنے گا۔ لامحالہ نہ صرف آزاد کشمیر کو بچانے کیلئے بلکہ خود پاکستان کی حفاظت کے لئے لازمی ہے کہ پاکستان کی فوج اس کا دفاع کرے۔ جب پاکستانی افواج اس کا دفاع کریں گی تو کیا خود مختاری کی صورت میں یہ ممکن اور جائز ہو گا اور اگر افواج پاکستان نے ہی بالآخر اس کا دفاع کرنا ہے تو پھر آزاد کشمیر کی خود مختاری کہاں تک باقی رہ جاتی ہے؟ اور اگر وہ دفاع نہ کرے تو ظاہر ہے کہ پھر کیا صورت ہو سکتی ہے۔ ہاں اگر وہی صورت یعنی بھارت کا حملہ مطلوب ہے تو پھر کوئی بحث نہیں

ہے۔ تو گویا اس تحریک کا نتیجہ یہ ہو گا کہ پاکستان کی اس نازک اور حساس سرحد کو ہم دشمن کے حوالے کر دیں گے۔ آزاد کشمیر کا علاقہ محض دفاعی سرحد ہی نہیں ہے۔ بلکہ اگر خدانخواستہ اس پر دشمن کا قبضہ ہو جائے تو پاکستان چاروں طرف سے گھر جاتا ہے اور اس کا کوئی تعلق خشکی کے ذریعہ باہر کی دنیا کے ساتھ نہیں رہ جاتا۔ سوائے ایران اور افغانستان کے۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ یہ تحریک بنگلہ دیش کی تحریک سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ کیونکہ یہ پاکستان کی شہ رگ کو کاٹنے والی تحریک ہے جس کی ہرگز اجازت نہیں دی جا سکتی۔

بھارتی حملے کے لئے سازگار فضا

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مقبوضہ کشمیر کا مسلمان ہمارے ساتھ ہے تو بھارت کو جواباً کہنا پڑتا ہے کہ آزاد کشمیر کا مسلمان پاکستان کے ساتھ نہیں ہے اور اسی لئے بھارت کو حق ہے کہ وہ اس کو آزاد کروانے کیلئے "پولیس ایکشن" کرے یا دوسری کارروائی کرے اور وہ کوئی کارروائی نہیں کر سکتا اور نہ ہی کرے گا جب تک اس کو آزاد کشمیر میں سازگار فضا میسر نہ آئے اور وہ سازگار فضا اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ آزاد کشمیر میں پاکستان کے خلاف اور پاکستان سے علیحدہ ہونے کی تحریک چل رہی ہو۔ ہمیں معلوم ہے کہ بھارت نے اس کے لئے کتنی سرتوڑ کوشش کی ہے۔ مگر ریاستی مسلمانوں نے اسے ابھی تک کامیاب نہیں ہونے دیا۔ ہم خود تو حکومت پاکستان سے (نہ کہ مملکت سے) لڑتے جھگڑتے رہے ہیں مگر بھائیوں کی طرح۔ وہ ہی راہ حق و صواب تھا اور ہے۔ مگر بھارت کو کبھی اس سے ایسی شہ نہیں ملی۔ کہ وہ اس کو عملی بنیاد بنا سکے۔ البتہ پراپیگنڈا کے لحاظ سے وہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ۱۹۵۵ء کے افسوسناک حالات پر بھی وہ پروپیگنڈا کرتے رہے اور ۱۹۶۲ء کے انتخابات کے نتائج کے بارے میں بھی دو ماہ تک بھارتی ریڈیو کہتا رہا کہ وہ ووٹ جو لبریشن لیگ کو ملے وہ سب پاکستان کے خلاف پڑے ہیں۔ مگر اس کو معلوم تھا کہ اس کیلئے وہ بات نہیں بنتی جو وہ چاہتا ہے لیکن اگر خدانخواستہ خود مختاری کی تحریک یہاں چل پڑے تو پھر اس کا راستہ روکنے کی کون سی صورت ہو گی؟ اور وہ راستہ براہ راست پاکستان کی سلامتی اور بقاء سے متصادم ہو گا۔

ملکی معیشت خطرے میں

اسی طرح اگر بفرض محال ان دوستوں کی بات بن جائے جو پاکستان کے یا تو دشمن ہیں یا نادان دوست اور آزاد کشمیر کو ایک خود مختار ریاست قرار دے دیا جائے۔ چلو یہ بھی مان لیا کہ یہ دوست پاکستان کے

بارے میں بھی بالکل مخلص ہیں۔ اور ہم ہی انہیں غلط سمجھ رہے ہیں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ لوگ ہمیشہ آزاد کشمیر پر برسراقتدار رہیں گے؟ اور دنیا کے بدلے ہوئے حالات کا اثر وہاں نہ ہو گا اور ایسے لوگ جو حقیقی معنوں میں علیحدگی نہ چاہتے ہوں پاکستان کے اعلیٰ مفادات کا خیال رکھیں گے؟ ایسی صورت میں آزاد کشمیر کے جنگلات کی لکڑی جس کی صرف پاکستان میں ضرورت ہے' کی مثال لیجئے کیا اس کے بارے میں کوئی خود مختارانہ پالیسی ہو سکتی ہے یعنی اگر آزاد کشمیر چاہے کہ یہ لکڑی بھارت کو دے تو اس میں کیا امر مانع ہو گا؟ اور اس کا پاکستان کی معیشت پر کیا اثر ہو گا؟ اسی طرح آزاد کشمیر سے بہہ کر پاکستان میں جانے والے دریاؤں خصوصاً دریائے جہلم کے پانی کے بارے میں منگلا سے پیدا ہونے والی بجلی اور خود منگلا ڈیم کی پاکستان کو جو ضرورت ہے اور افادیت ہے' اس کے بارے میں کیا کیا جائے گا؟ اور کیا پاکستان کی کوئی بھی حکومت اپنی معیشت کو اس طرح معرضِ خطر میں ڈال سکتی ہے۔ تو کیا اس طرح یہ مسئلہ پاکستان کیلئے ایک مستقل اقتصادی مسئلہ نہیں بنے گا؟ اور اس سے فائدہ کس کو ہو گا؟ درست ہے کہ اس کا جواب متعصبانہ انداز میں کچھ نہ کچھ دیا جا سکتا ہے مگر ایک مخلص اور محب وطن پاکستانی کی حیثیت سے اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ دریائے چناب پر بند باندھ کر بھارت کس کا گلا گھونٹنا چاہتا ہے' معلوم ہے پاکستان کی معیشت کیلئے منگلا ڈیم کتنا اہم ہے' کس کو علم نہیں۔ مگر اس کا علم بہت کم لوگوں کو ہے کہ منگلا ڈیم کی زندگی کا آزاد کشمیر اور خصوصاً پونچھ اور مظفر آباد کے اضلاع کے پہاڑی علاقوں کے ساتھ کتنا تعلق ہے۔ یہ پہاڑی علاقے اس ڈیم کا مرکزی " Catchment Area " ہیں اور ان کے بارے میں حکومت پاکستان کسی بھی وقت اصولاً غافل نہیں ہو سکتی ورنہ اس عظیم منصوبے کی عمر کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اگر اس منصوبہ کو ہی غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ آزاد کشمیر میں خود مختاری کی تحریک کا کتنا اثر پاکستان کی معیشت پر پڑے گا۔ ان پاکستانیوں کی عقل و ہوش پر ماتم کرنا چاہئے جو خود کو 'عقل کل' تو سمجھتے ہیں مگر ان کی نگاہ ان ظاہر اور باہر امور پر نہیں ہے۔ اگر دل میں کھوٹ ہے تو وہ زیر بحث نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک تو چونکہ مسئلہ کشمیر کو پاکستان سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا' اس لئے اس معاملہ کو بھی پاکستانی مفادات کے نقطۂ نظر سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا البتہ وہ عناصر جن کے نزدیک پاکستان اور کشمیر دو علیحدہ ملک ہیں اور ان میں دو علیحدہ قومیں بستی ہیں' ان کی بیماری کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں ہے اور نہ ہی ان کے درد کا کوئی درمان ہے۔

بھارت کے سر پر لٹکتی تلوار

مسئلہ کشمیر کے اس وقت تین فریق ہیں۔ پاکستان' بھارت اور کشمیری عوام دو فریق ایک طرف ہیں جبکہ تیسرا تنہا ہے۔ پاکستان علیحدہ ہو جائے تو پھر صرف دو ہی فریق رہ جاتے ہیں اور وہ اخلاقی سیاسی قوت جو

اس مسئلہ کو پاکستان کے فریق ہونے کی وجہ سے حاصل ہے وہ سرے سے غائب ہو جاتی ہے خاص کر جبکہ کشمیری اس وقت عملاً ایک کمزور فریق ہیں۔ الحاق پاکستان کی تحریک اور پاکستان کے فریق ہونے کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر میں اس وقت تک بھارت اپنی کوششوں کے باوجود مسلم اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اور کشمیری مسلمانوں کو خوش رکھنے کیلئے بھارت کو کشمیر میں کچھ نہ کچھ مراعات دینا پڑتی ہیں۔ جوں ہی اس کی صورت بدل جائے گی تو یہ قصہ بھی ختم ہو جائے گا۔ شیخ محمد عبداللہ وغیرہ کی بھارت کو اس لئے محتاجی تھی کہ یہاں الحاق کی تحریک قائم و دائم ہے۔ ورنہ شیخ صاحب پہلے ہی سرے سے سیاسی زندگی ختم کر چکے ہوتے یا پھر جیل میں ہی ہوتے۔ ایک طرح سے نظریۂ پاکستان مستقل تلوار ہے جو بھارت کے سر پر لٹک رہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اسی تحریک کی وجہ سے بھارت کو مقبوضہ کشمیر میں ہر وقت بھاری تعداد میں فوج بھی رکھنا پڑتی ہے اور بھارتی معیشت کیلئے یہ ایک عذابِ مسلسل ہے۔ بھارت کو تو اس میں خوشی ہوگی کہ پاکستان ایک فریق کی حیثیت سے اس مقدمہ سے دستبردار ہو جائے تاکہ بھارت کے دست جفاکیش کو توڑنے والا کوئی نہ ہو اور اسی طرح وہ مقدمے کے تیسرے فریق یعنی کشمیری مسلمان کو بآسانی مغلوب کر کے ریاست پر اپنا تسلط مستحکم کرے۔

لہٰذا ان حالات و واقعات اور مستقبل کے احتمالات و خطرات کے پیش نظر مسئلہ کشمیر کا واحد اور واحد حل اس کا پاکستان کے ساتھ الحاق ہے۔ اسی سے پورے برصغیر بلکہ جنوب مشرقی ایشیاء میں امن و سلامتی کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ ورنہ یہ مسئلہ ایک جوالا مکھی پہاڑ ہے کہ اگر پھٹ گیا تو نہ صرف برِّصغیر کا امن تہ و بالا ہو جائے گا بلکہ عالمی امن کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

پیپلز پارٹی اور آزاد کشمیر

پیپلز پارٹی بنانے کی وجہ تو بھٹو صاحب ہی بتا سکتے تھے۔ میں ان کے یہاں پیپلز پارٹی بنانے کے اصولی طور پر خلاف تھا۔ نہ صرف پیپلز پارٹی بلکہ کوئی بھی جماعت جس کا مرکز پاکستان میں ہے، اسے آزاد کشمیر میں نہیں ہونا چاہئے تاوقتیکہ ریاست جموں و کشمیر کا فیصلہ نہ ہو جائے۔ سہروردی مرحوم نے پہلے یہاں عوامی لیگ بنانا چاہی۔ میرے ساتھ ان کی بات ہوئی تو انہوں نے اس کو توڑ دیا۔ فیلڈ مارشل ایوب خان نے مسلم لیگ بنانا چاہی۔ بعد میں میرے ساتھ بات کرنے کے بعد انہوں نے اس خیال کو ترک کر دیا۔ بھٹو صاحب کو میں نے خط بھی لکھا اور زبانی بھی بات کی۔ وہ میری بات سے اتفاق بھی کرتے تھے۔ انہوں نے کچھ عرصہ تک اس کو التوا میں بھی رکھا لیکن شملہ معاہدہ کے بعد پھر انہوں نے اس عمل کو تیز کیا اور آزاد کشمیر کو صوبہ بنانا پیپلز پارٹی کے منشور میں شامل کیا۔ میرا خیال ہے کہ یہاں پیپلز پارٹی کو معرض وجود میں لانے کا بنیادی مقصد آزاد کشمیر کو پاکستان کا صوبہ بنا کر مسئلہ کشمیر کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا تھا۔ جو



صدر محمد ایوب اور شیخ محمد عبداللہ

شملہ معاہدہ میں درون خانہ طے ہوا ہو گا' کیونکہ اس سلسلے میں لکھا ہوا تو کچھ نہیں ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ کچھ معاملات وہاں بھی طے ہوئے ہوں گے۔ اس کی بنیاد پر انہوں نے یہاں آزاد کشمیر میں پیپلز پارٹی کو داخل کیا۔ یہ بھٹو صاحب کی اپنی ایک خاص سیاست تھی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ شاید مسلم کانفرنس کے ساتھ یہ سیاست نہیں نبھ سکے گی' تو وہ بھی ان کی ایک غرض تھی غالباً اس قسم کی کئی ثانوی اغراض تھیں۔ لیکن بنیادی غرض مجھے وہی معلوم ہوتی ہے۔

پیپلز پارٹی۔ حکومت آزاد کشمیر

یہ حقیقت ہے کہ ان کو کوئی حق نہیں تھا' نہ اس کا کوئی جواز بنتا تھا سوائے اس کے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے' بلکہ شملہ سے واپس آتے ہی شملہ معاہدہ میں شامل ایک صاحب نے مجھے ایک کاغذ کے پرزے پر لکھ کے کسی دوست کے ذریعے بھیجا تھا کہ وہاں تین باتوں کا فیصلہ ہوا ہے۔ ایک یہ کہ امریکہ میں جو فری کشمیر سنٹر جس کو یوسف بچ چلا رہے تھے' اس کو بند کر دیا جائے گا۔ چنانچہ وہ فوراً بند کر دیا گیا۔ دوسرے یہ کہ مقبوضہ کشمیر میں شیخ عبداللہ کو حکومت دی جائے گی اور تیسرے یہ کہ آزاد کشمیر میں میری حکومت کو برطرف کیا جائے گا۔ انہوں نے شملہ سے آتے ہی یہ تین باتیں لکھ کر بھیجی تھیں۔ اس کے بعد یہی تین باتیں پے در پے واقع ہوئیں' ورنہ انہیں کسی قسم کا قانونی اور اخلاقی حق نہیں تھا بہر حال انہوں نے مداخلت کی اور ہم نے بھی ان کی بہت مخالفت کی۔

آزاد کشمیر بیس کیمپ

ہمارا یقین اسی بات پر ہے کہ آزاد کشمیر تحریک آزادی کشمیر کا بیس کیمپ ہے اور اس کا بیس کیمپ رہنا چاہئے جب تک کشمیر کا مسئلہ طے نہیں ہو جاتا۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ آزاد کشمیر بیس کیمپ رہے جیسا کہ شروع سے تھا۔ وہاں کچھ دوسری قوتیں بھی موجود رہی ہیں جو اس بیس کیمپ کی حیثیت کو بالکل ختم کرنا چاہتی تھیں اور اب بھی چاہتی ہیں تاکہ مسئلہ کشمیر کوئی مسئلہ نہ رہے اور یہ معاملہ ختم ہو جائے تو یہ کشمکش ہمارے درمیان جاری ہے اور آزاد کشمیر کے اندر جو تبدیلی آئی کہ آزاد کشمیر کے اندر انتخابات ہوں' جمہوری حکومت ہو یہ سب چیزیں بیس کیمپ کی نفی کرنے والی ہیں اور اس کی مخالف ہیں۔ دوسری طرف وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو مایوس بھی ہونا پڑا اور جو مایوس لوگ ہیں وہ مایوسی کا اعلان تو نہیں کرتے لیکن دل میں مایوس ہیں اور وہ بھی اس کوشش میں ہیں کہ یہ آزاد کشمیر جیسا ہے اسی طرح رہے تو ٹھیک ہے۔ مگر ہم لوگوں نے اللہ کے فضل و کرم سے اس حالت میں بھی اس فضا

کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے اور اس کو بیس کیمپ ہی رکھا ہے۔ اب ہم اس کے ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتے۔ کوشش ہماری یہی ہے کہ یہی ڈھانچہ بیس کیمپ کی ضروریات کو پورا کرے۔ چنانچہ ہم نے خدا کے فضل و کرم سے یہ بات باقی رکھی ہے۔ نظام چاہے صدارتی ہو یا پارلیمانی بلا براہ راست نمائندگی ہو، جیسا کہ ابتدا میں تھا کہ مسلم کانفرنس کی حکومت تھی، کوئی بھی نظام ہو اس کا دارومدار افراد پر ہے، ان کی نیت پر ہے ان کے اخلاص پر ہے۔ اگر اسی گاڑی کا رخ دوسری طرف موڑ دیں تو ظاہر ہے کہ یہ گاڑی منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتی ہے۔ تو اس وجہ سے اس میں کوئی تبدیلیاں لانے کی سردست ضرورت نہیں ہے۔ اسی کو ہم مقبول اور طاقتور بنا کر اس سے ہم انشاءاللہ وہ کام لے سکتے ہیں جو تحریک آزادی کے بیس کیمپ کے شایان شان ہو۔

انگلستان میں مسئلہ آزاد کشمیر

میں نے انگلستان میں جو کچھ کیا وہ پہلے سے طے شدہ منصوبہ بندی کے مطابق نہیں تھا۔ خیال تو ہمارا تھا کہ ہم لوگ بیرون پاکستان کام کریں لیکن انگلستان میں مجھے اچانک جانا پڑا اور وہاں جانے کے بعد جو وقت مجھے ملا اس کا میں نے استفادہ کیا۔ تو خدا کے فضل سے مجھے اس میں اپنی طرف سے بہت اطمینان ہوا ہے کہ ہم نے وہاں اس وقت کا اچھا خاصا فائدہ اٹھایا جو ہمیں وہاں ملا اور اس پروگرام کو ہم نے جاری رکھنے کی بھی کوشش کی ہے۔ مثلاً میرے باہر سے آنے کے بعد ہم نے وہاں سے پارلیمینٹ کے ممبر اور دوسرے سیاسی لوگوں کو آزاد کشمیر میں آنے کی دعوت دی ہے، اسی طرح اور کئی لوگوں کو بھی آزاد کشمیر آنے کی دعوت دی ہے۔ شاید ہمارے وزیر اعظم ایک دو ماہ میں خود بھی باہر جائیں گے اور ہم اس سلسلہ کو جاری رکھیں گے اور پھر انگلستان میں مقیم ہمارے کارکن وہاں ایک کانفرنس بھی کرنا چاہتے ہیں تو اس طرح یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ انگلستان میں لیبر پارٹی کے جو لیڈر ہیں، ان کو سمجھانے کے لئے ہمیں خاص طور پر زیادہ محنت کرنا پڑی۔ انگلستان تو درکنار خود یہاں ہمارے اپنے لوگوں کو ہی کشمیر کے بارے میں زیادہ علم نہیں رہا، تو انگلستان کے لوگوں کو کیا علم ہو گا۔ ان کو تو سرے سے کوئی علم ہی نہیں تھا، نہ کنزرویٹو پارٹی کو، نہ حکمران پارٹی کو۔ لیکن لیبر پارٹی کو خاص طور پر سمجھانے میں وقت لگا اور محنت کرنا پڑی۔ اس لئے کہ وہ ہمیشہ بھارت کی طرف زیادہ مائل رہے ہیں اور ان میں مسٹر مائیکل فٹ جو ان کا لیڈر ہے، ان کے ساتھ بات کرنے میں خاصی محنت کرنا پڑی۔ وہ یہ بات سننے کے لئے تیار ہی نہیں تھے کہ استصواب رائے وغیرہ ہو۔ تو بہرحال گفتگو کے دوران جلدی ہی وہ اس بات پر آمادہ ہو گئے تھے کہ ہمارا جو دعویٰ ہے اور ہمارا جو معاملہ ہے وہ مبنی بر حق ہے۔

مسئلہ کشمیر اور جماعتوں کا اتحاد

یہ سوال بھی بڑا اصولی سوال ہے کہ اصولی طور پر ہم بہت ساری باتیں کہتے تو ہیں مگر وہ کر نہیں سکتے۔ ہماری تو ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے اور جو ایک دو اتحاد آزاد کشمیر میں ہوئے ہیں وہ خالصتاً ہماری یعنی مسلم کانفرنس کی کوشش سے ہوئے اور اب بھی ہماری خواہش یہ ہے کہ مسئلہ کشمیر پر سب دوست اکٹھے مل کر بیٹھیں، مل کر بات کریں اور مل کر پروگرام بنائیں۔ لیکن بدقسمتی سے باقی دوستوں کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا اچھا نہیں لگتا۔ لیکن محسوس ایسا ہوتا ہے کہ باقی دوستوں کی نگاہ میں کشمیر کے طریقہ کار پر ہمارا اختلاف ہے۔ مثلاً خورشید صاحب کے ساتھ طریقہ کار پر بھی اختلاف ہے اور مقاصد میں بھی اختلاف ہے۔ حیات خان ہیں، ان کی ساری دوڑ یہیں آزاد کشمیر تک محدود لگتی ہے۔ کوئی خواہش ہے، نہ خیال ہے، نہ اس بات کی سمجھ ہے کہ کشمیر کی آزادی کیا ہے کیا نہیں ہے؟ یہی حال چوہدری نور حسین صاحب کا ہے۔ اس صورتحال کے پیش نظر مل کے کیا بیٹھیں اور کس کے ساتھ بیٹھیں اور کیا کریں؟ یہ خدا کا شکر ہے کہ مسلم کانفرنس جو اکثریتی جماعت ہے، وہ ٹھیک راستے پر ہے۔ اس کا مقصد بھی اور طریقہ کار بھی ٹھیک ہے۔ اس لئے ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اگر کسی وقت ان کے ساتھ بیٹھنے کا موقع میسر آئے تو ہم اسے مسترد نہیں کرتے، نہ انکار کرتے ہیں۔

مسئلہ کشمیر کا پُرامن حل

فوجی حل تو میں نے سارے عرصے میں کسی وقت بھی تجویز نہیں کیا کہ یہ کوئی حل ہے۔ اگرچہ وہ بھی ایک حل ضرور ہے مگر وہ ایک آخری معاملہ ہے۔ جب اس کے بغیر کام نہ چل سکتا ہو، مگر کشمیر پر ہم فوجی طریقوں کے مقابلہ میں سیاسی طریقوں سے زیادہ دباؤ پیدا کر سکتے ہیں۔ سابقہ فوجی تجربات کے بارے میں بھی میرے خیالات تھوڑے سے مختلف ہیں کہ وہ تجربات ٹھیک تھے اور وہ کرنا چاہئیں تھے یا نہیں؟ نیز یہ کہ وہ غلط طریقے سے ہوئے یا صحیح طریقے سے؟۔ وہ بھی ایک مسئلہ ہے اور ایک علیحدہ معاملہ ہے۔ میں ان کی کامیابی یا ناکامی کو اپنے کھاتے میں یا کشمیریوں کے کھاتے میں نہیں ڈالتا اس کی ناکامی کے اور اسباب تھے۔ ان سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ تو اس لئے میں ہمیشہ سیاسی حل کی بنیاد پر ہی بات کرتا ہوں اور آج کل بھی وہی بات کرتا ہوں۔



خان عبدالحمید خان

وادئ کشمیر اور نوجوان عنصر

یہ حقیقت ہے کہ وادیٔ کشمیر کے اندر نوجوانوں میں تحریک موجود ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہاں آزادی کی تحریک سے زیادہ اگر وہ اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے کی تحریک چلے تو وہ زیادہ مفید بھی ہے اور محفوظ بھی۔ نتائج کے اعتبار سے بھی زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ وہ تحریک وہاں چل رہی ہے اور ہم اخلاقی طور پر اپنے بیانات کے ذریعے اور جہاں جہاں کہیں وہ ملتے ہیں، ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں ہم وہاں ابھی اس طرح کی براہ راست تحریک چلانے کے حق میں نہیں ہیں۔ ہم ان کو یہاں سے کوئی باقاعدہ سہارا نہیں دے سکتے اور ان کی مدد نہیں کر سکتے۔ جب تک ہم اس پوزیشن میں نہ ہوں، تب تک ہم ان سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس قسم کی کوئی تحریک چلائیں۔ البتہ وہ اپنے تہذیبی، ثقافتی، تاریخی اور مذہبی تشخص کو برقرار رکھنے کے لئے وہاں تحریک چلا رہے ہیں اور اس میں انہیں ہماری اخلاقی امداد حاصل ہے۔

پاکستان اور سپر پاورز

کسی وقت میرا خیال تھا کہ شاید اکیلا پاکستان ہی سپر پاورز کی آویزش کا اکھاڑہ بنتا جا رہا ہے، لیکن اس وقت تو ساری دنیا سپر پاورز کی آویزش کا اکھاڑہ بنتی جا رہی ہے اور کسی ملک کے لئے اس کے سوا اب کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ وہ اس سے بچے ہوئے ہیں، وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ ساری دنیا اور خود سپر پاورز اس آویزش کی لپیٹ میں ہیں۔ اس سے کوئی ملک باہر نہیں رہ سکتا۔ اس کے اندر رہ کر جو کیا جا سکتا ہے، وہی کیا جائے گا۔ یہ اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنے والی بات ہے کہ ہم بڑے آزاد ہیں اور غیر وابستہ ہیں یا خود مختار ہیں۔ نہ روس آزاد ہے نہ امریکہ، نہ ہی چین آزاد ہے۔ سب لوگ اپنی آزادی کو دوسرے عناصر کا مرہون منت سمجھتے ہیں اور اس آویزش کا اکھاڑہ بنے ہوئے ہیں۔

کشمیر کی محرومیت کا سبب

اس سلسلہ میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ دنیا آزاد ہونے کے باوجود ابھی تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ ملکوں کو یہ آزادیاں برائے نام حاصل ہوئیں۔ وہ ایک ہاتھ سے آزاد ہوئے تو دوسرے ہاتھ سے انہیں غلام بنا دیا گیا۔ ایک تو یہ بھی سبب ہو گیا کہ کشمیر کی آزادی کے کوئی معنی اس لحاظ سے نہ رہے۔ دوسرا یہ کہ ہم اپنے سے کئی گنا ایک بڑی طاقت کے ساتھ نبرد آزما ہیں جو فکری طور پر ہم سے بہتر ہے اور جسے سیاست میں ایک بڑا مقام حاصل ہے۔ اس کو سیاسی استحکام بھی حاصل ہے۔ ان کے وسائل

اور ذرائع بھی ہم سے زیادہ ہیں اور انہوں نے دنیا میں اپنا تاثر بھی بہت بہتر طریقے سے قائم کیا۔ پھر یہ کہ جس حکومت یا ملک کی امداد سے ہم کچھ کر سکتے تھے، خود اس کی سلامتی ہمارے راستے میں حائل ہو گئی۔ ہماری اپنی صفوں میں انتشار پیدا ہو گیا۔ بدقسمتی سے ایسے کئی اسباب ہیں جس کے باعث کشمیر کی تحریک آزادی ابھی تک کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکی۔ خدا کے فضل و کرم سے ہم پیش قدمی کر رہے ہیں اور بڑی پیشرفت ہو رہی ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ تاریکی جو پہلے تھی وہ اب بھی قائم رہے، اس کے کئی حصے چھٹ گئے ہیں۔ باقی حصے بھی اِن شاءاللہ چھٹ جائیں گے اور اگر کوشش جاری رہے تو اس کے اچھے نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔

آزاد کشمیر میں اسلامی معاشرہ

میرا خیال ہے آزاد کشمیر میں مختلف مسالک موجود ہیں مگر اسلامائزیشن کے راستے میں یہ کوئی زیادہ رکاوٹ ثابت نہیں ہوں گے۔ باقی ملک میں تو ایسی رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے لیکن ہمارے ہاں صورتحال قدرے مختلف ہے۔ اسلامی معاشرہ قائم کرنے کے راستے میں اور بہت سی باتیں ہیں جن پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ابھی تک اس کے لئے مناسب ماحول نہیں ہے، نہ حکومت کی مشینری میں، نہ تعلیمی اداروں میں، نہ نیم سرکاری اداروں میں اور نہ ہی عوام الناس میں۔ لوگ کہتے ضرور ہیں کہ اسلامی نظام نافذ ہو لیکن عملاً اس کے خلاف کرتے رہتے ہیں۔ ہم اس ماحول کو درست کرنے کے لئے کام کر رہے ہیں اور انشاءاللہ العزیز میرا یقین ہے کہ رفتہ رفتہ ہم اس میں اپنے پروگرام کے مطابق چلتے رہیں گے۔ یہ بات کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی کہ ہم قرون اولیٰ کا نظام یہاں قائم کر دیں گے اور سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے خلفائے راشدین کا دور آ جائے گا اگرچہ بعض لوگ اس قسم کی باتیں بھی سوچتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہو سکتا۔ موجودہ دور کے مسلمان کے لئے جتنا ہو سکتا ہے اور ہم جس قسم کے مسلمان ہیں، اس کے مطابق جو ہو سکتا ہے، اتنا ہم انشاءاللہ العزیز کر رہے ہیں اور اس کو ہم جاری رکھیں گے۔

بھارت پر چینی حملہ

بھارت پر چینی حملہ ہمارے لئے اچھا موقع تھا مگر کیا اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہم تیار تھے۔ یہ تو مفروضے کی بنیاد پر بات کہی جاتی ہے۔ ہم لوگ بعد میں فرض کر لیتے ہیں کہ ہم پہلے سے تیار بیٹھے تھے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تو خواہ مخواہ بھارت اور دوسروں پر احسان جتا کر اپنی لاج رکھی، ورنہ ہم

کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھے' اور نہ ہی کچھ کرنے کی سوچ تھی۔ اگر سوچ ہوتی اور تیاری ہوتی اور پھر کچھ نہ کیا ہوتا' تو یہ بات کہی جا سکتی تھی کہ ہم نے کچھ نہیں کیا اور بڑا نازک موقع ہاتھ سے جانے دیا۔ ملک کے اندر تیاریاں اس کے برعکس ہوتی رہیں۔ اس لئے یہ کہنا درست نہیں کہ وہ بڑا اچھا موقع تھا۔ وہ واقعی ایک موقع تھا لیکن ہم اس کے لئے تیار نہیں تھے۔

پاکستان کے دفاعی معاہدے

مجھے تاریخ وار اس کا علم نہیں ہے کہ پاکستان کے ساتھ روس کا رویہ کب سے معاندانہ ہوا لیکن ایک بات مجھے معلوم ہے کہ روس کا جو ایشیائی سلامتی کا پلان ہے وہ بہت دیر سے بنا ہوا تھا۔ اس پلان میں کشمیر کے بارے میں روس کی پوزیشن کچھ اسی قسم کی تھی کہ وہ ہمارے خلاف بھارت کے ساتھ چلے۔ بلکہ وہ اسی وقت بھارت کے حق میں ہو گیا تھا جب لیاقت علی خان مرحوم نے روس کی دعوت مسترد کر کے امریکہ کی دعوت قبول کی تھی تو اصل میں غلطی کا آغاز وہیں سے ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ غلطی نہ ہوئی ہوتی تو روس کا طرز عمل مختلف ہوتا۔ لیکن اس میں بھی ایک بڑا ضروری اور قابل توجہ امر یہ ہے کہ روس کی دوستی اگر ہمیں حاصل ہو جاتی تو ہم کیا کرتے یعنی ہماری فوجوں کا اسلحہ' ہماری فوجوں کی تربیت' ہمارے نظام چلانے کے تمام وسائل و ذرائع سب کے سب امریکی طرز کے ہیں۔ ان حالات میں روس بیک وقت اپنی فوج بھیج کر ہمارا دفاع بھی کرتا' ہمیں ٹریننگ بھی دیتا اور ہمیں اسلحہ بھی مہیا کرتا۔ یہ کام دنیا کا کوئی بھی ملک نہیں کر سکتا۔ امریکہ کے ساتھ دوستی کرنے کے لئے قائداعظمؒ سمیت بعد تک ہماری حکومت کو بے پناہ پاپڑ بیلنے پڑے بسا اوقات اتنی سختیاں برداشت کرنا پڑیں کہ کوئی آزاد ملک برداشت نہیں کرتا۔ لیکن اس ملک کو بچانے کا اس وقت کوئی اور طریقہ نہیں تھا۔ یہ تو کہنے کی باتیں ہیں جو ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر ایئر کنڈیشنڈ مکانوں میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں کہ ایسے ہو جاتا اور ویسے ہو جاتا۔ لیکن جن لوگوں نے یہ کیا وہ اپنے زمانے کے بڑے مدبّر لوگ تھے۔ جن حالات میں انہوں نے یہ فیصلہ کیا افسوس کی بات ہے کہ انہوں نے اس سلسلے میں کچھ لکھا نہیں۔ غیروں نے تو لکھا ہے' ہندوستان کے کچھ لوگوں نے لکھا ہے بلکہ ہندوستان کے بعض مصنفین نے الزام لگایا ہے کہ امریکہ نے اس وقت پاکستان کی امداد کر کے زیادتی کی۔ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ حالات ایسے تھے کہ اس وقت پاکستان کو بچانے کا کوئی اور راستہ نہیں تھا کیونکہ ہم ملک کو ہندوستان سے نہیں بچا سکتے تھے۔ روس تو کچھ کرتا یا نہ کرتا مگر ہندوستان پاکستان پر پے در پے حملہ کرنے کی کوشش کرتا رہا اور امریکہ نے اس کو روکے رکھا۔ امریکہ کی مدد سے اب پاکستان کے اندر جو تھوڑی بہت مضبوطی ہوئی ہے اور استحکام پیدا ہوا ہے میں سمجھتا ہوں اس کا ایک پہلو یہی ہے جسے پیش نظر رکھنا چاہئے۔ جو لوگ عملی صورتحال اور واقعات سے ہٹ کر سوچتے ہیں' وہ کئی دفعہ اس قسم کی عجیب و

غریب باتیں کر لیتے ہیں کہ اگر یہ کیا جاتا تو وہ ہو جاتا، لیکن ایسا ہو نہیں سکتا۔ پھر یہ کہنا کہ امریکہ پر کیا تکیہ کر سکتے ہیں، جب تک ہم نالائق ہیں اور کمزور ہیں، تب تک تو ہمیں امریکہ پر تکیہ کرنا ہی پڑے گا۔ جب ہم ٹھیک ہو جائیں گے تو پھر کوئی ضرورت نہیں ہو گی۔ جب تک ہماری اپنی کمزوریاں ہیں اس وقت تک ظاہر ہے کسی نہ کسی کا سہارا لینا پڑے گا۔ آج دنیا میں سب لوگ کمزور ہیں، کوئی طاقتور نہیں ہے۔ بھارت جیسا ملک امداد کے لئے مارا مارا پھر رہا ہے۔ کبھی امریکہ کے دروازے پر اور کبھی روس کے دروازے پر۔ جب اتنا بڑا ملک محتاج ہے تو ہم کون ہیں۔ ایک تو ہم اندر سے مضبوط نہیں ہیں اور پھر باہر اتنا بڑا دشمن ہے اور کچھ من چلے لوگ اندر بیٹھ کر کہتے ہیں کہ کسی پر تکیہ نہ کرو۔ یہ تو ایسی بچگانہ بات ہے جس کا کوئی سرپاؤں نہیں ہے۔ امداد امریکہ کی ہو یا برطانیہ کی، فرانس کی ہو یا چین کی، ہمیں تو اپنے وجود کی سلامتی کے لئے سب لوگوں سے امداد لینا چاہئے اور ان سے دوستی بھی کرنا چاہئے۔ جس کی دوستی ہمارے لئے زیادہ مفید ہے، اس سے دوستی کر لینا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بدلے میں بھی کچھ دینا پڑتا ہے کیونکہ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جو امداد دے اور اس کے بدلے میں کچھ نہ لے۔ مثلاً چین کی امداد امریکہ کر رہا ہے تو امریکہ چین سے اس کے بدلے میں کچھ لے رہا ہے۔ اگر وہ روس کی امداد کر رہا ہے اور اسے غلّہ دے رہا ہے تو اس کے بدلے میں ضرور کچھ لے گا۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ پاکستان کو تھالی میں رکھ کر لوگ امداد دیں اور پیر کی طرح نیاز قبول کرنے کو کہیں۔ دنیا کی سیاست میں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ جب تک ہم اندرونی طور پر کمزور ہیں، ہمیں دوسروں سے امداد لینا ہو گی۔ اس میں کوئی قباحت کی بات نہیں نہ عذر خواہی کی بات ہے۔ ساری دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ انڈیا ہم سے کئی گنا بڑا ملک ہے لیکن وہ بھی دوسروں سے امداد لے رہا ہے اور امداد صرف اس لئے لے رہا ہے کہ وہ ہم سے ڈرتا ہے حالانکہ ہمارا ملک اس سے پچاس گنا چھوٹا ہے۔ ہم ایک چھوٹا ملک ہیں۔ لیکن ہمارے ارد گرد بڑے پہاڑ قد ملک بیٹھے ہیں۔ اگر امریکی امداد نہ ہو تو گزارہ مشکل ہے اور امریکہ نے تو بڑے مشکل اور بڑے آڑے وقت میں ہمارا ساتھ دیا ہے۔ ہمارے لوگوں کی یہ بڑی ناشکری ہے اور یہ مخالفین کا، خاص طور پر روسی لابی کا پروپیگنڈہ ہے کہ وہ ایک اچھی بات کو برے رنگ میں دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ امریکہ نے بہت بڑے نازک موقعوں پر ہماری مدد کی ہے۔ اگر وہ مدد نہ کرتا تو کوئی ملک بھی اس وقت ہماری مدد کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ چین جیسا ہمارا پڑوسی دوست بھی ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ تو یہ ایسی صورت ہے جس کی ناشکری بھی نہیں کرنا چاہئے اور اس پر معذرت خواہی بھی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تو یونہی اپنی کمزوری کا اظہار کرتے ہیں۔

۱۹۴۷ء کی جنگ

سیز فائر کے وقت ہم سری نگر کے قریب نہیں تھے۔ بات یہ ہے کہ ہم نے جب جہاد شروع کیا۔ اس وقت سے لے کر تقریباً ۱۵ ماہ کے جہاد میں ایسا تھا جس میں زیادہ لڑائی مجاہدین خود لڑ رہے تھے اور

ہمارے درمیان کوئی رابطہ نہیں تھا۔ مثلاً میں اپنے سیکٹر کے بارے میں جانتا تھا۔ دوسرے سیکٹر کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ کوئی کمیونیکیشن نہیں تھا اور مرکزی کمانڈ بھی نہیں تھی۔ اس طرح کچھ لوگ سری نگر پہنچ گئے۔ کوئی جموں کے قریب چلے گئے ہیں خود پونچھ کے گرد بیٹھا تھا۔ کافی دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ یہ پوزیشن جو آج ہے، ہم اس وقت اس سے تھوڑا سا آگے تھے۔ میں نے جب پونچھ بریگیڈ کی کمان چھوڑی ہے تو اس کے بعد معاملہ الٹ ہو گیا۔ بدقسمتی سے ہم نے کچھ مورچے چھوڑ دیئے جب انڈین آرمی کا وہاں پر دباؤ بڑھ گیا۔ میں ان حالات کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا جن کی وجہ سے ایسا ہوا، لیکن پھر وہ ہمیں دھکیل کر پیچھے لے آئے جہاں ہم اس وقت ہیں۔ کچھ جگہیں ایسی تھیں جو ہمارے پاس تھیں مگر سیز فائر کرتے وقت کمانڈرز کو جلدی میں خیال نہ رہا، جنگ بندی کرتے وقت وہ چھوڑ دیں تو مجموعی طور پر یہی پوزیشن تھی جہاں اس وقت ہم کھڑے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں جو کچھ ہوا وہ اس کے علاوہ ہے۔ اس سلسلے میں اختلافات نجانے کیا ہیں؟ میں نے تو کچھ نہیں سنا کہ کیا اختلافات ہیں۔ کوئی کیا کہتا ہے۔ اس میں تو اختلافات کی بات مجھے معلوم نہیں ہے۔ البتہ اس بات پر ضرور اختلاف ہے کہ اگر ہم یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو جنگ بندی نہ کرتے تو کیا صورت ہوتی۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ انڈین آرمی آگے بڑھ جاتی اور بعض کا خیال یہ ہے کہ فروری کے آخر میں ہم بارہ مولہ کے قریب ہوتے اور ہمیں دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی تھی۔ برف پگھلنا شروع ہو جاتی۔ راستے صاف ہو جاتے اور ہم آگے چلے گئے ہوتے یہ البتہ اختلاف رائے ضرور ہے لیکن جنگ بندی لائن پر کوئی اختلاف نہیں ہے۔

۱۹۵۵ء کے حالات

۱۹۵۵ء کے حالات اصل میں اس طرح پیدا ہوئے کہ سردار ابراہیم خان صاحب کو جب صدارت سے ہٹا دیا گیا تو انہوں نے اس پر بہت ردعمل کا اظہار کیا اور فوراً مسلم کانفرنس کے نام پر ہی ایک متوازی تحریک چلا دی بلکہ آزاد کشمیر میں متوازی حکومت بنانا شروع کر دی اور انہوں نے آزاد کشمیر میں ایسی ایجی ٹیشن کی کہ جس کا حکومت کے پاس کوئی فوری حل نہیں تھا۔ بعض جگہ لوگوں سے مکمل لاقانونیت کرا دی اور مالیہ ادا کرنا بند کروا دیا۔ حکومت کی جو اتھارٹی تھی وہ صرف مظفر آباد میں تھوڑی سی رہ گئی تھی۔ یہ صورتحال بھی بعض لوگوں کی مرہون منت تھی۔ پونچھ، کوٹلی اور میرپور غرض ہر طرف بلکہ پونچھ میں خاص طور پر لاقانونیت پیدا ہو گئی تھی کہ لوگ اسلحہ لئے کھلم کھلا پھرتے تھے اور من مانی کرتے تھے۔ حکومت کے اہلکاروں کو پکڑ کر لے جاتے تھے اور پکڑ کے جہاں چاہیں رکھتے تھے اور جہاں چاہیں چھوڑ دیتے تھے۔ یہ صورتحال پورے آزاد کشمیر میں مجموعی طور پر اور پونچھ میں خصوصی طور پر پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے اس دور میں بھی چل پھر کے لوگوں کو سمجھایا کہ ایسا نہ کریں بلکہ بعد میں جلسہ کے دوران کچھ

لوگ میرے پاس آ گئے۔ یہ لوگ بے تحاشہ جنگل کاٹ رہے تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ یہ جنگل ہمارے اپنے کام آئیں گے۔ یہ کسی دشمن کے نہیں ہیں۔ آپ لوگ کیوں یہ جنگل کاٹتے ہیں حالانکہ وہ لوگ میری بہت عزت کرتے تھے خاص طور پر باغ کے لوگ 'لیکن وہ اتنے مشتعل تھے کہ اس معاملے پر لوگوں کے ساتھ میری سخت تلخ کلامی ہوئی اور میں نے لوگوں سے سختی کے ساتھ کہا تم خواہ مخواہ اپنا نقصان مت کرو۔ میں نے بعد میں اپنی آنکھوں سے پھر وہ حشر دیکھا کہ خدا کی پناہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور میں جہاں کہیں کوئی مسلم کانفرنسی نظر آتا تو لوگ اسے گالیاں دیتے۔ لوگ چوہدری صاحب مرحوم کو اور ہم سب کو گالیاں دیتے تھے۔ اگرچہ ذاتی طور پر مجھے کچھ زیادہ مطعون نہیں کیا گیا ورنہ کسی مسلم کانفرنسی کو معاف نہیں کیا گیا۔ مولوی غلام حیدر جنڈالوی کے ساتھ اس معاملے میں سب سے بڑی زیادتی ہوئی۔ لوگ ان کو پکڑ کے لے گئے اور ان کے منہ میں پیشاب کیا گیا۔ ان کی داڑھی نوچی گئی۔ ان کا چار پانچ لاکھ روپے کا گھر جلایا گیا۔ ان کے گلے میں رسی ڈال کر کتے کی طرح گلیوں میں پھرایا گیا۔ پونچھ میں تنہا سردار سید علی خان تھے جو پلندری میں اپنے دفتر میں آ کے بیٹھتے تھے اور مسلم کانفرنسی کہلاتے تھے لیکن ان کے گرد بھی برادری کا کوئی آدمی بیٹھنے اور بات کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ آپ اس سے لاقانیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ لوگ ایس پی اور ڈی سی کو پکڑ کر لے جاتے اور خود فرضی ڈی ایس پی بن بیٹھتے۔ اس طرح کی ایک لاقانونیت سارے آزاد کشمیر کے اندر پھیلی ہوئی تھی۔ یہ تو محض حسن اتفاق ہے کہ ان دنوں دشمن کو آزاد کشمیر پر حملہ کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ ورنہ اگر وہ حملہ کر دیتا تو آزاد کشمیر کے اندر مزاحمت کرنے کی کوئی صورت نہ تھی 'بلکہ یہ بات بھی پھیلائی گئی کہ لوگ جو اسلحہ استعمال کر رہے تھے 'وہ سیز فائر لائن کے دوسری طرف سے آیا ہوا ہے 'حالانکہ یہ اسلحہ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء کے دور جہاد کا لوگوں کے گھروں میں محفوظ تھا۔ یہ اسلحہ بہت بڑی مقدار میں تھا۔ پونچھ کے علاقے میں بالعموم اور سدھنوتی میں بالخصوص یہ اسلحہ کافی مقدار میں موجود تھا۔

بدقسمتی اصل میں یہ ہوئی کہ بڑے اچھے لوگ جب آزاد کشمیر میں یا پاکستان میں تقریر کرتے تھے تو وہ طاقت کی بات کرتے تھے۔ وہ برملا کہتے تھے کہ اگر ایسا نہیں ہوا تو ہم ایسا کر دیں گے۔ میں نے کہا کہ یہ طاقت کچھ نہیں ہے۔ اس کی بنیاد پر بات نہ کریں۔ لیکن اس سے ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا تھا جو چاہتا تھا کہ اس برادری کا حکومت اور فوج کے ساتھ تصادم ہو۔ تو ہم یہ اسلحہ بھی ضبط کر لیں اور یہ طاقت بھی ساری ٹھیک کر لیں۔ میں نے یہ بات دھیر کوٹ میں ایک بڑی میٹنگ میں کہی تھی جس میں کرنل رحمت اللہ خان مرحوم 'سردار ابراہیم خان اور سدھن برادری سے تعلق رکھنے والے بڑے سرکردہ لوگ بیٹھے تھے۔ میرے ساتھ اگرچہ بڑا اختلاف تھا لیکن مجھے ایک بات کا براہ راست پتہ لگ گیا تھا۔ لہٰذا میں چاہتا تھا کہ انہیں بتاؤں کہ طاقت کی بات نہ کریں اس کا نتیجہ بڑا خراب ہو گا۔ میں نے انہیں وہاں جا کر کہا لیکن وہ سب لوگ طاقت کے نشے میں تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ دیکھئے آپ کے خلاف یہ بہت بڑی سازش ہو رہی

ہے۔ آپ مہربانی کر کے اس پھندے میں نہ پھنسیں۔ اس تحریک کو آپ ختم کریں اور امن کے ساتھ جو کچھ ہو سکتا ہے کریں۔ اس پر سردار ابراہیم خان مشتعل ہو گئے۔ کہنے لگے آپ ہمیں درس دینے آئے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ جو چاہیں کریں میں آپ کو درس نہیں دیتا۔ لیکن میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے جو بات مناسب تھی آپ کو کہہ دی ہے اب آپ جانیں اور آپ کا کام' جو کچھ ہو گا اسے بھگت لیں۔

پھر فی الواقع وہی ہوا جس کا تھوڑا بہت مجھے قبل از وقت علم ہو گیا تھا سارے علاقے کو فوج کے حوالے کیا گیا تو فوج کے ایک دستے کے ساتھ راولا کوٹ' بارل اور پلندری کے علاقے میں فائرنگ کا تبادلہ بھی ہوا۔ کچھ لوگ ادھر سے مارے گئے کچھ لوگ ادھر سے مارے گئے۔ لوگوں نے فوج کا اسلحہ پکڑ لیا تو وہ اسلحہ بھی بعد میں سردار ابراہیم خان صاحب نے واپس کروایا۔ شورش کرنے والے لوگوں کے خلاف فوجی کارروائی شروع ہو گئی۔ پھر پنجاب کانسٹیبلری آ گئی۔ لوگوں نے اسلحہ جمع کرا دیا اور پھر اس دور میں جو قیامت آئی ہے اور پنجاب کانسٹیبلری نے ہمارے لوگوں کا جو حشر کیا' اسے سن کر ہی رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی حق بجانب تھے کیونکہ اگر وہ یہ حشر نہ کرتے تو یہ لوگ خود دوسرے لوگوں کا وہی حشر کر دیتے جو انہوں نے جنڈالوی مرحوم کا کیا تھا جس کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ ایک معزز آدمی اور عالم دین کے ساتھ یہ سلوک بداخلاقی کی انتہا تھی۔ اختلاف کی بات اختلاف کی حد تک رہنا چاہئے تھی۔ آخر جنڈالوی صاحب کون سا کسی کے ساتھ لڑ رہے تھے جو ان کے ساتھ وہ سلوک کیا گیا اس وقت تو لوگ سمجھتے تھے کہ بس ہم نے ہتھیار اٹھا لئے ہیں تو سب معاملہ ٹھیک ہو گیا ہے۔ چنانچہ جب لوگوں نے متوازی حکومت بنائی تو حکومت پاکستان نے مجبوراً یہ کارروائی کی اور اس کارروائی کے نتیجہ میں لوگوں کو بہت پریشانی اور تکلیفیں اٹھانا پڑیں۔ پنجاب کانسٹیبلری والوں کی پھر جو سمجھ میں آیا اور ان کا جو بس چلا' وہ کیا' جو بداخلاقی یا زیادتی وہ کر سکتے تھے انہوں نے کی۔ میں نے دیکھا تو نہیں البتہ سنا کہ پلندری بازار میں بڑے بڑے معزز لوگوں کے گلے میں رسیاں ڈال کر انہیں جانوروں کی طرح بازار میں گھسیٹتے پھرتے تھے۔ کسی سے کہتے کہ کتے کی آواز نکالو اور کسی سے کہتے کہ بلی کی آواز نکالو اور پھر ان پر کوڑے برساتے۔ اسی طرح جیل کی ایک ایک کوٹھڑی میں جو ایک آدمی کے لئے بنی ہوتی تھی وہ پچاس پچاس چالیس چالیس آدمی بند رکھتے تھے۔ وہاں تو پھر انہوں نے ظلم و تشدّد کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس دارو گیر میں کافی لوگ گرفتار ہو گئے۔ میں اسی اثناء میں صدر منتخب ہو گیا تو میں نے پھر وہ لوگ رہا کرائے اور وہ معاملہ ٹھنڈا ہو گیا۔ انہوں نے قائد ملت سے اور سکندر مرزا سے بات کی۔ اس سلسلے میں سب سے اچھا کردار پاکستان کے سیکرٹری نیاز خان کا رہا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔ انہوں نے میری بات کو ٹھیک اور درست سمجھا اور باقی یہ سب غلط ہے کہ دشمن سے پیسہ آیا ہے اور اسلحہ آیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح وہ تلخی آہستہ آہستہ کم ہو گئی۔ میں خدا کے فضل و کرم سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر میری جگہ کوئی دوسرا صدر ہوتا تو وہ یہ جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ حکومت پاکستان سے پوچھے بغیر قیدیوں کو چھوڑ دے۔ میں نے ان کو پیسے بھی دلوائے اور ان سے

اچھا سلوک بھی کیا میں ان کے ساتھ جلسے بھی کرتا اور ان کے پاس جا کے بھی بیٹھتا اور بات چیت بھی کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ سعادت بھی بخشی ہے کہ میرے ہاتھوں اس وقت ایسا ہو سکا۔

۱۹۵۵ء کے حالات کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ ہر اس جگہ پر جہاں لوگوں نے اپنے مرکز بنائے ہوئے تھے وہاں گزر گاہ یا راستہ میں پولیس والے کوڑا لٹکا دیتے اور لوگوں سے کہتے کہ اس کو سلیوٹ کرو اور اس طرح لوگوں کو بے عزت کرتے تھے۔ ہمارے پاس بھی ایسا ہوا۔ ملوٹ کے ایک ماسٹر عبد العزیز جو ابھی زندہ ہیں، بھی اس شورش میں شامل تھے۔ وہ شروع میں تحریک آزادی میں بھی ہمارے ساتھ شریک تھے۔ پولیس وہاں بھی گئی اور اس علاقے پر بھی قبضہ ہو گیا۔ انہوں نے وہاں بھی کیمپ قائم کر دیا۔ وہ تمام ارد گرد کے لوگوں کو بلاتے، دن بھر ان کو کان پکڑوائے رکھتے اور شام کو کہتے کہ گھر چلے جاؤ۔ جن لوگوں کو میں جنگل کاٹنے سے روکتا تھا میں نے دیکھا کہ انہوں نے اپنی بھینس، گائے، بیل بیچ کر اور بعض نے تو اپنی بیویاں رہن رکھ کر مالیہ ادا کیا اور انہیں مالیہ بھی چار پانچ سال کا کئی کئی دفعہ ادا کرنا پڑا۔ کبھی ایک سرکاری اہلکار وصول کرتا اور کبھی کوئی دوسرا۔

اس وبا کی ہوا ہمارے گاؤں کے لوگوں تک بھی آئی جہاں اس قسم کی شورش نہیں تھی، البتہ ہمارے ہاں بھی کچھ لوگ سردار ابراہیم خان کے ساتھی تھے لیکن میری وجہ سے عباسی اور تیزیال برادری کے علاقہ میں زیادہ تر لوگ پر امن رہے تو وہ سب لوگ میرے پاس آئے کہ کیا کریں؟ میں نے انہیں کہا کہ آپ آج نہ جائیں، کل میں بھی چلوں گا۔ میرے خیال میں یہ تھا کہ میں جاؤں گا اور ان سے یہ پوچھوں گا کہ تمہارا یہ کیا کام ہے کہ ہر آدمی کو بلا کے سزا دیتے ہو، خواہ اس نے جرم کیا ہی نہ ہو۔ کیا تم کو کوئی خدا کا خوف نہیں ہے؟ میرے دل میں بڑی تلخی تھی۔ اس صورت میں کوئی حادثہ بھی ہو سکتا تھا۔ اسی رات خواب میں میں نے دیکھا کہ ایک جگہ ہے جہاں سے حضور داتا صاحبؒ آ رہے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ پنجاب کانسٹیبلری تھی۔ جب ہم آمنے سامنے ہوئے تو میں نے ان سے سخت شکایت کے لہجے میں کہا کہ حضور! آپ ان نامعقول لوگوں کو ساتھ لے کر چل رہے ہیں۔ اس پر آپ مسکرائے۔ آپ نے کہا کچھ نہیں، بس مسکرائے اور خواب ختم ہو گئی۔ جب خواب ختم ہوئی اور میں بیدار ہوا تو میری طبیعت میں وہ تمام تلخی ختم ہو گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کچھ ہوا ہی نہیں اور جب صبح اٹھے تو اس علاقے میں ان پولیس والوں کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ہم نے ان گاؤں والوں کو بلایا تھا یا نہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ سارے علاقے میں جیسے آگ بجھ گئی ہو۔ ان کا رویّہ بالکل تبدیل ہو چکا تھا بلکہ وہ ہمیں تلاش کرتے تھے اور ہم سے مشورہ طلب کرتے تھے کہ کیا کریں کیا نہ کریں۔ اس خواب سے تھوڑی دیر بعد کی بات ہے کہ میں نے ایک بس لی اور اس میں اپنے پانچ چھ ساتھیوں سمیت سوار ہوا، جن میں رزاق خان بھی تھے جو ایس پی ہو کے ریٹائر ہوئے تھے۔ ہم چھ آدمی منگ بجری، راولاکوٹ اور پلندری جانے کے لئے بس پر سوار ہوئے تاکہ ان لوگوں سے ملیں اور مل کے بات چیت کریں۔

یہ غالباً اس خواب کے بعد کی بات ہے۔ یہ خیال بھی مجھے خواب کے دوسرے دن آیا۔ حالانکہ ایک تحصیل سے دوسری تحصیل میں بغیر پرمٹ جانے پر سخت پابندی تھی۔ میں نے کہا دفع کرو۔ چلتے ہیں، جہاں کہیں کسی نے پوچھا، دیکھ لیں گے۔ ہم لوگ جب منگ بجری میں پیر صاحب کے مزار سے گزرنے لگے تو بس خراب ہو گئی۔ گرمی بہت تھی۔ میں نے کہا کہ چلئے پیدل ہی چلتے ہیں۔ ہم اس جگہ سے گزرے تو ہم نے سڑک پر قدم رکھا تو ایسا لگا کہ ہم کسی آگ کے الاؤ میں آ گئے ہیں۔ وہیں پھر لوٹ کر آئے۔ جب ہم وہاں سے پیچھے لوٹے تو معلوم ہوا کہ فضا اور طرح کی ہے۔ پھر ہم آگے گئے۔ میں نے ساتھیوں سے بھی کہا۔ میں نے کہا کہ کیا آپ کو بھی اس کا احساس ہے؟ کہنے لگے ہم بھی یہی محسوس کرتے ہیں۔ ہم جوں جوں آگے جا رہے تھے۔ ایسے لگتا تھا کہ آگ کے قریب جا رہے ہیں تو مجھے احساس ہوا کہ شاید اس طرف خدائے تعالیٰ کی ناراضگی کا اثر ہے۔ جوانی کا زمانہ لا ابالی پن کا عالم ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ ناراضگی ہے تو ہم بھی سب لوگوں کے ساتھ شریک ہیں۔ خدا کی قدرت ہے اگر بس ٹھیک نہیں ہو گی تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ مجھے یہ بھی احساس ہو گیا کہ بس اسی وجہ سے خراب ہے تاکہ قدرت کی طرف سے اسے ایک اشارہ غیبی سمجھا جائے۔ میں نے دل میں سوچا کہ ہم نے جانا ضرور ہے۔ یہ میں سوچ ہی رہا تھا کہ بس ٹھیک ہو گئی۔

ہم وہاں سے گزرے اور راولا کوٹ گئے۔ راولا کوٹ میں جو دو چار پانچ لوگ تھے، میں نے ان کو بلایا اور پھر لوگ ملتے ملاتے شکایتیں کرتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ بھئی! یہ شکایتیں مت کرو۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب اس بات کو برداشت کرو اور اس کا مقابلہ کرو۔ لیکن یہ مت کہو کہ وہ یہ کر گئے اور وہ کر گئے۔ یہ بڑی بزدلی ہے اور ایک تو وہ کر گئے جو کر گئے۔ اب تم اپنی آنے والی نسلوں کو یہ کہانیاں سناؤ گے یہ بہت بری بات ہے۔ کل ہی ہم نے ایک بڑا معرکہ سر کیا ہے، جنگ لڑی ہے، ہمارے متعلق لوگ کیا کہیں گے۔ ہماری نسلیں کیا کہیں گی کہ یہ بزدل لوگ تھے۔ لہٰذا جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ اب اس کو برداشت کرو" چنانچہ اس کا بہت اچھا اثر ہوا۔ وہاں کرنل رحمت اللہ خان تھے اور دوسرے معزز لوگ تھے۔ کچھ لوگ رہا ہو گئے تھے۔ ان دنوں پھر میں وہاں سے ہجیرہ گیا۔ وہاں ہجیرے میں جب ہم پہنچے تو میرے پیٹ میں تکلیف ہو گئی کہ ہر دس منٹ، ۵ منٹ کے بعد اسہال ہونے لگے۔ پانی بھی پیٹ میں نہ ٹھہرتا تھا۔ وہاں پر ایک نالہ ہے، ہم اس کے کنارے چلے گئے۔ سب علاقہ ویران اور سنسان تھا، نہ کوئی انسان نہ انسان کی ذات، خوف کے مارے بہت پریشانی تھی کہ کیا کریں۔ تو مجھے خیال آیا کہ یہاں بطور محافظ ایک عورت ہے۔ کوئی مرد ہوتا تو وہ ہمارا خیال کرتا تو یہ جو عورت ہے ہو سکتا ہے ہندوؤں کے ساتھ ادھر بھی ملی ہوئی ہو اور ادھر بھی۔ میں دل میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں مجھے ایک خواجہ صاحب کا خیال آیا جو فوت ہو گئے ہیں۔ وہ ہمارے جماعتی تھے۔ ان کو پتہ چلا تو وہ کہنے لگے کہ آپ کدھر آ گئے۔ چنانچہ رات کو ہم ان کے گھر ٹھہرے۔ دوسرے دن میں نے اس عورت کو بھی دیکھا جو واقعی عورت ہی تھی۔ مجھے دیکھ کے

مسکراتی ہوئی وہاں سے گزر گئی۔ یہ پاگل عورت تھی اس کا پتہ لگا کہ سرحد پار بھی جاتی ہے۔

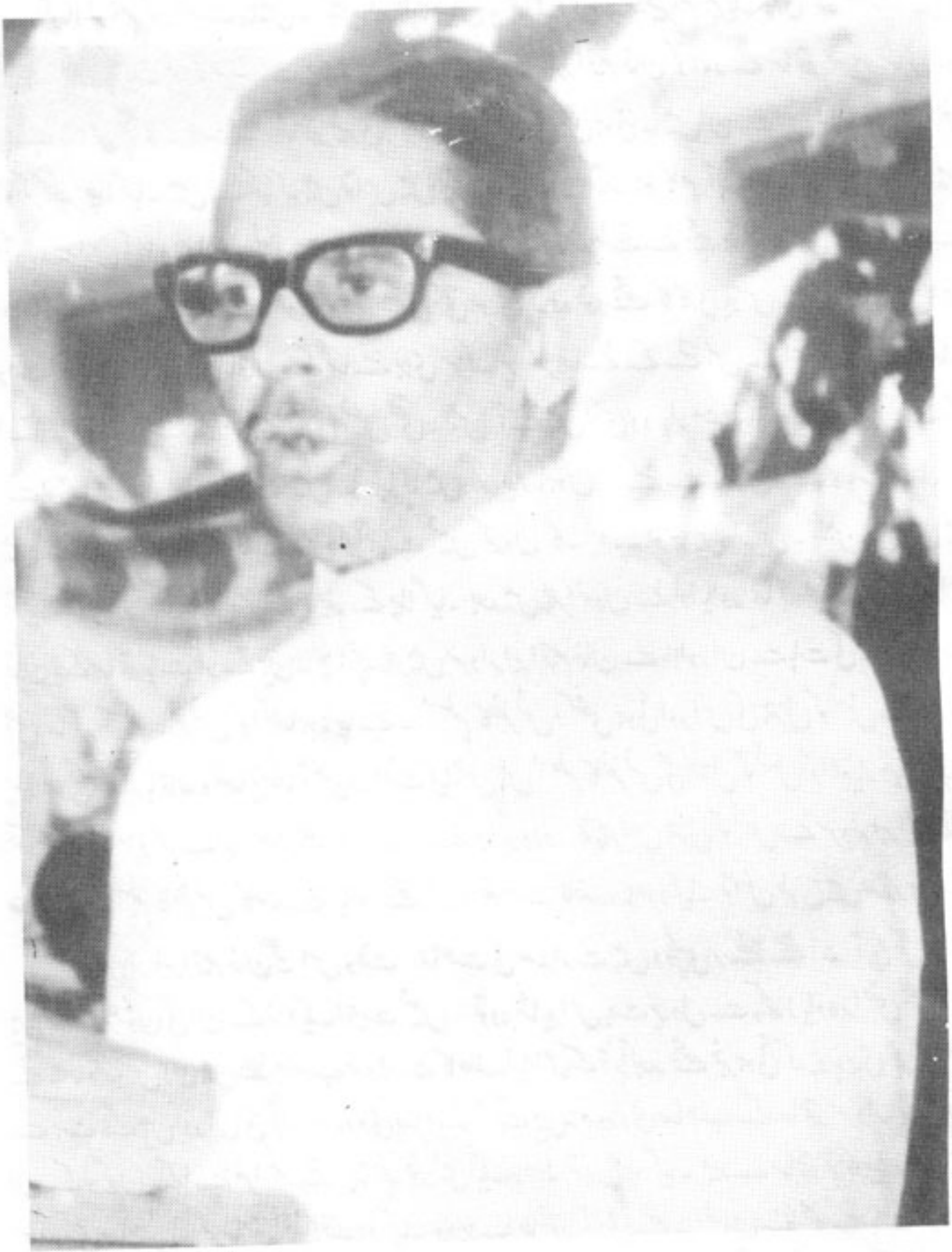
پھر ہم وہاں سے پلندری آ گئے۔ پلندری بھی سنسان بیابان تھا، کوئی شخص، کوئی انسان وہاں نہیں تھا۔ پنجاب کانسٹیبلری والے ایک طرف کیمپ لگائے ہوئے تھے۔ وہ گھور گھور کے ہمیں دیکھ رہے تھے کہ یہ کون لوگ ہیں اور اجازت کے بغیر ادھر آزادی سے کیسے گھوم پھر رہے ہیں۔ وہاں ایک کمرے پر مشتمل ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا یہ برائے نام ہوٹل دھیر کوٹ کی طرف کے کسی آدمی کا تھا تو اس نے ہوٹل بند نہیں کیا، ورنہ کوئی مقامی آدمی وہاں بازار میں نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ ہم وہاں سے چلے گئے۔ مجھے پلندری میں جا کے ایسا محسوس ہوا کہ یہاں ضرور خدائی قہر و غضب کا اثر ہے۔ یہ فقط احساس کی بات تھی۔ اس کی کوئی مادی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ وہاں جا کے مجھے احساس ہوا کہ وہاں محافظین میں سے بھی کوئی موجود نہیں ہے تو میں نے ہوٹل والے سے کہا کہ چلو وہاں پانی پر وضو کر کے نفل پڑھتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے وہاں جا کر کافی دیر تک نفل پڑھے اور دعا کی کہ اللہ تعالیٰ اس سرزمین کو اپنے قہر و غضب سے بچائے۔ میرے ساتھی مجھے بعد میں کہنے لگے کہ بھائی! تم عجیب آدمی ہو کہ ایک طرف ان لوگوں سے ہماری مخالفت ہے، دوسری طرف ان کیلئے دعائیں کرتے ہو۔ یہ کیا سیاست ہے؟ بہرحال میرا اپنا طریقہ تھا۔ پھر ہم لوگ وہاں سے واپس آ گئے۔ خدا نے کیا کہ وہ آگ ٹھنڈی ہو گئی۔

سہروردی اور میری حکومت

پاکستان میں سہروردی کا اقتدار میری سیاست کا اہم حصہ ہے جس کی تفصیل یہ ہے ۱۹۵۶ء میں یا کچھ عرصہ پہلے چوہدری محمد علی وزیر اعظم بن گئے تو ان کے ساتھ قائد ملت چوہدری غلام عباس اور ان کی وجہ سے ہمارے بڑے اچھے مراسم اور گہرے تعلقات تھے۔ میں چوہدری صاحب سے ملا اور میں نے ان سے مل کر کشمیر کی تحریک آزادی کے بارے میں کچھ باتیں کیں۔ جو میرا اپنا خیال تھا، انہیں بتایا کہ تحریک آزادی کشمیر کو کیسے دوبارہ شروع کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا تم نے سکندر مرزا سے بات کی۔ میں نے کہا کہ نہیں، کہنے لگے اس سے بھی بات کریں۔ چنانچہ میں سکندر مرزا کے پاس گیا۔ ان سے بات کی۔ جب ان سے بات کی تو وہ کہنے لگے کہ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں ہمیں کمانڈر انچیف کا مشورہ لینا پڑے گا۔ تو میں نے کہا ان سے مشورہ لے لیں۔ کہنے لگے نہیں، تم خود جاؤ اور کمانڈر انچیف سے بات کرو۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم کمانڈر انچیف ہو گئے تھے، تو میں ان کے پاس آیا۔ جب میں نے ان سے بات کی جس کا تعلق انہی کے ساتھ تھا کیونکہ جب میں نے چوہدری محمد علی اور سکندر مرزا کو اپنا منصوبہ بتایا تو انہوں نے کہا تھا کہ اس کے جواب میں ہو سکتا ہے کہ بھارت پاکستان پر حملہ کر دے تو کمانڈر انچیف بتا سکتے ہیں کہ آیا ہم یہ ذمہ داری لے سکتے ہیں یا نہیں۔ ہم نہیں بتا سکتے۔ چنانچہ میں نے فیلڈ مارشل کو یہی بات بتائی۔ میں نے

کہا یہ ہمارا منصوبہ ہے۔ آپ اس بارے میں بتائیں کہ کیا صورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ ہم بھارت کے حملے کا بہت کامیابی سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس کی کوئی فکر نہ کریں اور اگر کشمیر کی آزادی کے لئے کوئی تحریک چلتی ہے تو اس کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہو گا۔ چنانچہ میں پھر چوہدری صاحب کے پاس گیا۔ انہوں نے کہا کہ آپ کمانڈر انچیف سے پوچھ لیں غالباً انہوں نے پھر خود بھی کمانڈر انچیف سے پوچھا ہو گا۔ بعد کے واقعات سے مجھے ایسا ہی محسوس ہوا کہ انہوں نے مجھ سے کہا کہ اچھا تم اس کام کے لئے جو تیاری کرنا چاہتے ہو' کرو' یہ صورتحال ۱۹۵۶ء میں میرے برسراقتدار آنے پر میرے ذہنی پس منظر کے طور پر پیدا ہو گئی تھی۔

چونکہ چوہدری محمد علی صاحب قائد ملت کا بہت احترام کرتے تھے۔ اس وجہ سے ان کا یہ خیال بھی تھا کہ آزاد کشمیر میں خالصتاً مسلم کانفرنس کی حکومت ہونی چاہئے۔ چنانچہ جب یہ بات ہو گئی تو چوہدری محمد علی صاحب نے مجھے پھر بلایا اور مجھے کہنے لگے کہ اس سارے قصے میں ہم آزاد کشمیر حکومت کو الگ تھلگ نہیں رکھ سکتے۔ آزاد کشمیر میں حکومت بھی اسی قسم کی ہونی چاہئے جس قسم کی تحریک تم لوگ چلانا چاہتے ہو اور وہ حکومت تب ہی بن سکتی ہے کہ تم خود جو اس خیال کے داعی ہو' حکومت میں ہو اور خود حکومت کے سربراہ ہو۔ تب جا کر حکومت اور تحریک کے درمیان تال میل ہو سکتا ہے۔ ورنہ کسی وقت بھی حکومت کے ساتھ اختلاف ہو سکتا ہے جس سے بڑی خرابی ہو جائے گی۔ انہوں نے بات بالکل صحیح کہی تھی کہ آزاد کشمیر کی حکومت میں تحریک آزادی کا کردار شامل ہونا چاہئے' ورنہ اس وقت میری خواہش نہیں تھی کہ میں حکومت میں جاؤں بلکہ میری خواہش یہ تھی کہ میں اس تحریک کو منظم کروں۔ حکومتیں اپنی جگہ کام کرتی رہیں۔ مگر انہوں نے میرے صدر بننے پر بہت اصرار کیا۔ وہ بہت بڑے حسابی آدمی تھے۔ چنانچہ میں اس پر رضامند ہو گیا۔ چوہدری محمد علی صاحب نے اس بات کو ہمارے کئی اور بہت سے اہم لوگوں سے مخفی رکھا کہ وہ مجھے صدارت قبول کرنے کے لئے کیوں زور دے رہے ہیں اور یہ مخفی رکھنے والی بات بھی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے قائد ملت چوہدری غلام عباس مرحوم سے بات کی۔ پھر میں نے بات کی اور ہم اس پر سوچنے لگے کہ یہ حکومت کس طرح معرض وجود میں آئے گی۔ میں نے چوہدری صاحب مرحوم سے اور چوہدری محمد علی مرحوم سے بھی کہا کہ سردار ابراہیم خان کو جو ہمارے بہت مخالف تھے اور سیاست میں ان کا اس وقت مرتبہ بھی بہت بلند تھا۔ مخالف ہونے کے باوجود ان کی طاقت ابھی محفوظ تھی' آج کی طرح انہوں نے اپنی طاقت کو ضائع نہیں کیا تھا۔ میں نے دونوں چوہدری صاحبان سے کہا کہ سردار ابراہیم خان کو اپنے ساتھ شامل کر لیں چاہے ہم انہیں اس تحریک کے بارے میں بتائیں یا نہ بتائیں' لیکن ان کو شامل ہونا چاہئے انہیں ہمارے سیاسی کام میں شریک ہونا چاہئے تو محمد علی صاحب نے کہا کہ یہ آپ کا اپنا اندرونی معاملہ ہے۔ اگر وہ شامل ہوں تو بہت اچھی بات ہے۔ ہماری طرف سے کوئی شرط نہیں ہے۔ آپ اگر چاہیں تو انہیں ساتھ رکھیں۔ جب یہ بات ہماری جماعت میں زیر بحث آئی تو کافی لوگوں کا خیال تھا کہ



سردار محمد حیات خان

سردار ابراہیم خان کو الگ رکھیں اور ہم لوگ یعنی مسلم کانفرنس والے' اور دوست یوسف شاہ مرحوم ان سب کو ملا کر ہم گورنمنٹ بنالیں۔ لیکن میرا اپنا خیال یہ تھا کہ اس کے بغیر ہم تحریک والی گورنمنٹ نہیں بنا سکتے۔ اگر تحریک کو کامیابی سے چلانا ہے تو اس میں سردار ابراہیم خان کو ہمارے ساتھ ضرور شامل ہونا چاہئے۔ اس پر قائد ملت کے ساتھ میری معمولی سی شکررنجی بھی ہوئی۔ میں ان سے اس پوائنٹ پر ناراض ہو کر گھر چلا گیا۔ میں نے کہا کہ میں تو اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ جو کام آگے چل کر نہیں ہو سکتا میں ابھی سے اس کی ذمہ داری لینے سے دست کش ہوتا ہوں۔ قائد ملت نے مجھے بلوایا۔ اس موقع پر مجھ سے ان کی شان میں ایک لحاظ سے تھوڑی سی گستاخی بھی ہو گئی کہ وہ خود مجھے کا کاجی ہاؤس ملنے آئے۔ میں اس وقت اتفاق سے کا کاجی ہاؤس کے سامنے بڑی سڑک پر گھر جانے کے لئے بس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اتنے میں وہ پہنچ گئے۔ ابھی بس پہنچی نہیں تھی۔ بس آنے میں ابھی دو چار منٹ باقی تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو۔ میں نے کہا کہ میں گھر جا رہا ہوں۔ کہنے لگے کہ میں نے کچھ بات کرنا ہے' میں نے کہا کہ میں اس معاملے میں کوئی بات نہیں کروں گا۔ آپ جو چاہیں کریں۔ لیکن میں اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ میں بس میں بیٹھ کے چلا گیا۔ بعد میں پھر انہوں نے بلوایا اور کہا کہ ٹھیک ہے۔ ابراہیم خان کے ساتھ بات کرتے ہیں۔ چنانچہ پھر میں سردار ابراہیم خان سے ملا اور ان سے بات کی۔ انہوں نے بھی کہا کہ مسلم کانفرنس کو اکٹھا ہونا چاہئے۔ مسلم کانفرنس اکٹھی ہوئی اور اس کی جنرل کونسل نے غالباً وہ پہلا موقع تھا کہ باقاعدہ لکھا پڑھا آئین ڈرافٹ کیا جس میں مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل کو اختیار دیا گیا کہ وہ حکومت کو نامزد کرے اور حکومت اسی کے سامنے جوابدہ ہو تو پھر اس جنرل کونسل نے سردار ابراہیم خان صاحب کو مسلم کانفرنس کا صدر بنادیا اور مجھے آزاد حکومت کا صدر نامزد کیا۔ تو اس طرح میں صدر ہو گیا۔

سردار ابراہیم خان نہ اس وقت جماعت کی صدارت میں دلچسپی رکھتے تھے' نہ آج کل رکھتے ہیں۔ جماعتوں کی ان کے نزدیک اہمیت نہیں تو وہ شاید اس بات پر دل سے کچھ زیادہ راضی بھی نہیں تھے۔ تاہم جس دن میں نے منصب صدارت کا حلف لیا۔ اس کے فوراً بعد مجھے خبر ہوئی کہ چوہدری محمد علی منظر سے ہٹ گئے ہیں اور ان کی جگہ سہروردی صاحب آ گئے ہیں۔ سہروردی صاحب کے ساتھ سردار ابراہیم اور ان کے لوگوں کے اپنے مراسم تھے' چنانچہ فوراً ہی ایک رابطہ شروع ہو گیا۔ میرے ساتھ تو کابینہ بنانے میں سہروردی صاحب کے ساتھ اختلاف ہو گیا۔ وہ بڑے طاقتور آدمی تھے۔ انہوں نے مجھ سے بات کرنا تھی مگر ناراض ہو گئے۔ ان کا ادھر ان لوگوں کے ساتھ رابطہ ہو گیا۔ اب یہ رابطہ مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سلسلے میں جو زیادہ اہم بات میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسی دوران پونچھ میں ۱۹۵۵ء کے ہنگامے کے جو قیدی تھے' ان کو میں نے گورنمنٹ پاکستان سے مشورہ کئے بغیر رہا کر دیا' بلکہ ان قیدیوں کو وزارت امور کشمیر سے کچھ مالی مدد بھی دلوادی۔ ان دنوں وزارت امور کشمیر میں مسٹر اظفر ایک بڑے اچھے اور محب وطن سیکرٹری ہوتے تھے' ان کو میں نے ساری بات سمجھائی تو انہوں نے ان لوگوں کے لئے کچھ مالی امداد کا انتظام کیا۔ اس پر سہروردی صاحب کو اور ان لوگوں کو بتایا گیا کہ سردار قیوم کو دیکھو کہ اس نے اتنے بڑے



جنرل عبدالرحمان خان

ہنگامے اور سنگین معاملے میں حکومت پاکستان سے پوچھا تک نہیں اور قیدیوں کو رہا کر دیا' وغیرہ وغیرہ۔ اس سے بھی میرے خلاف سی آئی ڈی والوں نے حسب عادت اور ہمارے ان دوستوں نے مل ملا کے ایک محاذ بنانا شروع کیا۔ لیکن وہ محاذ چوہدری غلام عباس مرحوم کو اپنے ساتھ شامل کئے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اب ایک بڑی الجھن یہ تھی کہ چوہدری صاحب کو کیسے شامل کریں۔ اس کے لئے انہوں نے چالاکی یہ کی کہ قائد ملت کے اور ہمارے ایک بڑے پرانے رفیق جوان معاملات میں بڑی دسترس رکھتے تھے' انہوں نے یہ کام ان پر چھوڑ دیا' سردار ابراہیم خان صاحب نے ان سے بات کی تو انہوں نے منجملہ اور باتوں کے ایک یہ منصوبہ بنایا کہ کچھ آدمیوں کو اپنے پاس بٹھا رکھا اور کوئی دو دو تین تین گھنٹے کے وقفے کے بعد ان کو ایک ایک کر کے قائد ملت کے پاس بھیجتے۔ ایک جا کے کہتا کہ میں مظفر آباد گیا تھا۔ جب میں سردار قیوم کو فلاں جگہ ملا اور میں نے اس سے آپ کے بارے میں بات کی تو وہ کہنے لگا کہ کون ہوتا ہے چوہدری غلام عباس' اس کا ہماری حکومت میں اور ادھر کیا دخل ہے۔ چوہدری صاحب کے ساتھ پہلے ایک غلط فہمی تھی' جیسا کہ شاید ابھی میں نے آپ کو بتایا تھا کہ یہ غلط فہمی شروع میں ہی میری حکومت بنتے ہی پیدا ہوئی تھی۔ ہوا یہ کہ جب میں نے کابینہ بنائی تو قائد ملت کا خیال تھا کہ غلام دین وانی کو وادی کی طرف سے کابینہ میں لیا جائے۔ میں نے اس کے بجائے پروفیسر عبدالعزیز کو کابینہ میں لیا۔ واقعہ یہ تھا کہ جب مجھے مسلم کانفرنس کی صدارت دی جانے لگی تو اس وقت میں بہت جونیئر لوگوں میں سے تھا۔ میں نے رئیس الاحرار سے بہت کہا کہ کسی سینئر آدمی کو صدر بنائیں۔ جب میں نے اس پر بہت اصرار کیا تو مجھے کہنے لگے کہ تمہیں صدر اسی وجہ سے نہیں بنا رہے ہیں کہ تم سب سے بہتر ہو بلکہ تمہیں صدر اس لئے بنا رہا ہوں کہ یہ باقی جتنے لوگ ہیں' یہ کشمیر کے بارے میں مایوس ہیں اور تم ہی ابھی ایسے ہو جس کے اندر کشمیر کی آزادی کا جذبہ اور امنگ موجود ہے۔ اس لئے ہم تمہیں مسلم کانفرنس کا صدر بنا رہے ہیں' ورنہ اس لئے نہیں کہ اس جماعت میں تمہاری کوئی زیادہ خدمات ہیں یا تم دوسروں سے بہتر ہو۔ جب میرے صدر بنانے کا وقت آیا' مجلس منعقد ہوئی تو اس وقت چونکہ میں جونیئر تھا' تو کوئی آدمی میرے ساتھ سیکرٹری جنرل بننے کے لئے تیار نہ تھا۔ غلام دین وانی تھے۔ ثناءاللہ شمیم تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم ایک جونیئر آدمی کے ساتھ سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے کام نہیں کریں گے۔ پھر پروفیسر عبدالعزیز میرے ساتھ جنرل سیکرٹری رہے۔ جماعت کو منظم کرنے میں انہوں نے بڑی محنت کی۔ جب گورنمنٹ بنانے کا وقت آیا تو میں نے قائد ملت سے کہا کہ جب یہ لوگ میرے ساتھ سیکرٹری جنرل بننے کے لئے تیار نہیں ہوئے تو پھر میرے ساتھ منسٹر کیوں بنیں؟ یہ حق بھی تو پھر پروفیسر عبدالعزیز کا ہے۔ لیکن رئیس الاحرار کی اپنی مصلحت تھی۔ انہوں نے اس بات کو محسوس کیا کہ میں نے ان کی بات نہیں سنی۔ کہنے والوں نے میرے خلاف بڑھا چڑھا کر باتیں کیں کہ وہ تو اب آپ کو مانتا ہی نہیں۔ سردار ابراہیم صدر ہو گئے ہیں اور یہ دونوں پونچھ کے رہنے والے ہیں۔ وہ سردار ابراہیم کی بات زیادہ مانتا ہے اور آپ کی بات کم مانتا ہے۔ یہ باتیں قائد ملت کو لگاتار میرے خلاف سنائی جاتی رہیں۔

سردار ابراہیم کی بات یہ تھی کہ وہ مسلم کانفرنس کے صدر تھے۔ میرے اپنے ڈسپلن کے نقطۂ نظر

سے میں سمجھتا تھا کہ گورنمنٹ سے صدر مسلم کانفرنس کا مرتبہ زیادہ بڑا ہونا چاہیئے۔ یہ خیال ہمارے ملک میں عام طور پر نہیں پایا جاتا۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ گورنمنٹ کا مرتبہ بڑا ہونا چاہیئے اور جماعت کا کم۔ لیکن کسی ملک میں جہاں تحریک چل رہی ہو' وہاں تو جماعت کا مرتبہ بلند نہ ہو تو تحریک نہیں چل سکتی۔ چنانچہ میں سردار ابراہیم کی بہت غیر معمولی عزت کرتا تھا' لیکن سردار ابراہیم خان کو قائد ملت کے ساتھ برابر کر کے میں نے کبھی نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی قائد ملت کے مرتبے کو کم کرنے کی کوشش کی۔ قائد ملت کا جو مرتبہ روز اول سے میرے ذہن میں تھا' وہی بدستور باقی رہا۔ سردار ابراہیم خان کے ساتھ میرا اختلاف بھی قائد ملت کے آنے پر یہیں سے شروع ہوا تھا۔ ضمناً یاد آ گیا کہ قائد ملت پنڈی پہنچے' کھانے پر پہلی مرتبہ ان سے اس طرح ملاقات ہوئی کہ سردار ابراہیم درمیان میں بیٹھے ہیں' دائیں طرف قائد ملت ہیں' بائیں طرف میں بیٹھا ہوں۔ کوئی بات چلی تو میں نے ابراہیم خان صاحب سے کہا اور چوہدری صاحب سے مخاطب ہوا۔ میں نے کہا کہ یہ جہاد آزادی کے لئے ہم نے جو یہ تحریک چلائی ہے' یہ تب ہی چلے گی جب جماعت کے اندر کسی قسم کا سیاسی اختلاف نہ ہو اور یہ اختلاف صرف اسی صورت میں ختم ہو سکتا ہے کہ ہم لیڈر شپ کو لیڈر شپ سمجھیں۔ چوہدری صاحب کہنے لگے کہ کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں نے کہا کہ سردار ابراہیم خان اور میں تو انقلاب کی پیداوار ہیں۔ ایک دن پہلے تو ہمارے گاؤں والے بھی ہم سے متعارف نہیں تھے لیکن صبح اٹھے تو ہم بہت بڑے لوگ بن گئے۔ تو اس سے اگر ہمارے دل میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ ہم بھی لیڈر ہو گئے ہیں تو یہ بڑا غلط خیال ہو گا اور اس سے تصادم ہو جائے گا۔ لیڈر ایک ہی ہونا چاہیئے۔ لیڈر روز روز نہیں بنتے' لیڈر عمریں کھپا کر بنتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ سردار ابراہیم خان صاحب پر میری بات کا برا اثر ہوا۔ چوہدری صاحب بھی پریشان ہو گئے۔ چوہدری صاحب نے بعد میں مجھ سے پوچھا کہ تم نے یہ بات کیوں کہی۔ میں نے انہیں کہا کہ میں اختلافات کے کچھ آثار دیکھتا ہوں۔ اسی لئے میں نے یہ بات کہی ہے۔ اگر آپ کے درمیان اختلاف ہو گیا تو یہ تحریک نہیں چل سکے گی۔ میں نے تو دونوں کی ہمدردی میں بات کی۔ کہنے لگے کیا تمہیں اس کا احساس نہیں ہے کہ سردار ابراہیم خان یہ بات سمجھے گا کہ شاید تم نے میری وجہ سے یہ بات کہی ہے یا میں نے کہلوائی ہے۔ میں نے کہا کہ اگر کوئی ایسا سمجھے تو یہ بڑی بدنیتی کی بات ہو گی۔

چوہدری صاحب ایک عرصے سے مجھے جانتے ہیں۔ میں کوئی اس طرح کی بات نہیں کرتا۔ میں جو بات صحیح سمجھتا ہوں کرتا ہوں' لیکن سردار صاحب نے غالباً وہی بات سمجھی ہو گی کیونکہ وہ شکی مزاج ہیں اور ان کی طبیعت شکی ہے۔ انہوں نے یہی سمجھا ہو گا کہ شاید چوہدری صاحب نے مجھ سے ایسا کرنے کو کہا ہے اور میں بھی کسی سازش میں شریک ہوں' حالانکہ ایسی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ تو خیر' میں یہ کہہ رہا تھا کہ چونکہ سردار ابراہیم خان صاحب صدر تھے جو بات مجھے کہتے جو کوئی خط لکھتے' میں اس کا بڑا احترام کرتا۔ ان کو جواب دیتا کہ یہ کام ہو گیا یا نہیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے خود مجھے کئی دفعہ کہا کہ آپ یہ اتنی خواہ مخواہ کیا محنت کرتے ہیں اور ہر خط کا جواب دیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے جواب تو ضرور دینا چاہیئے۔ کہنے لگے

کہ نہیں نہیں، یہ کوئی اس لئے تھوڑا ہی ہوتا ہے کہ تم جواب دو یا محنت کرو۔ جو کام ہو گیا ہو گیا اور بس۔ اس بات سے بھی مجھے بڑی پریشانی ہوئی۔ چونکہ میں اس بات کا بالکل عادی نہیں تھا کہ کسی کو ٹالنے کے لئے کوئی بات کہہ دوں یا سفارش کر دوں۔ لوگ تو اب یہ بات کرتے ہیں مگر میں یہ بات ہرگز نہیں کرتا۔ لوگوں نے قائد ملت کو یہ بتایا کہ سردار عبدالقیوم نے اپنے ذاتی استعمال کے لئے تقریباً ۱۲ ہزار روپے کا پلنگ خریدا ہے، پھر اسی طرح ہم نے کہا کہ ایک گاڑی خریدیں کیونکہ صدر کے پاس ٹوٹی پھوٹی گاڑی تھی۔ تو اس کے متعلق بھی لوگوں نے کہا کہ سردار عبدالقیوم بہت قیمتی گاڑی خرید رہے ہیں۔ حالانکہ ہم نے بہت قیمتی قسم کی گاڑی نہیں خریدی تھی بلکہ یہ عام قسم کی گاڑی تھی جو اس وقت بڑی سستی ملتی تھی۔ میں نے یہی گاڑی خریدنے کے لئے کہا تھا تو لوگ قائد ملت کو دن رات جا کے مجھ سے منسوب کر کے بتاتے تھے کہ چوہدری غلام عباس کون ہے اور اس کا حکومت سے کیا تعلق ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو یہ باتیں چوہدری صاحب تک پہنچتی رہیں۔ آدمی یکطرفہ باتیں سنتا رہے تو خواہ کتنا بڑا آدمی ہو ضرور متاثر ہوتا ہے۔ اس طرح اس دور میں اور بھی کئی باتیں ہوئی ہوں گی جن کا مجھے زیادہ علم نہیں ہے۔ چوہدری صاحب نے پھر مجھے باقاعدہ چارج شیٹ کیا۔ مجھے انہوں نے خط لکھ کے بھیجا کہ یہ یہ الزامات ہیں اس میں کچھ پونچھ کے بارے میں بھی تھا۔ ان کو بتایا گیا تھا کہ پتہ نہیں پونچھ میں کیا ہو گیا ہے۔ کوئی آٹھ دس باتیں تھیں جو اس وقت مجھے سب یاد نہیں ہیں۔ میں نے ان میں سے ہر ایک کا بالترتیب جواب لکھا۔ میرے دل میں تھوڑی سی تلخی بھی پیدا ہوئی۔ اس لئے کہ بعض ایسی باتیں تھیں جن کی انکوائری چوہدری صاحب خود کر سکتے تھے بجائے اس کے کہ ریکارڈ پر لکھ کر بھیجیں کیونکہ ہم لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے عزیز ہیں۔ چھوٹے ہیں ان کے ساتھی ہیں۔ میں نے کہا کہ جہاں تک ۱۲ ہزار روپے کے پلنگ کا معاملہ ہے۔ آپ کبھی پریذیڈنٹ ہاؤس میں آ جاتے۔ ایسے ہی پھرتے پھراتے دیکھ لیتے کہ کتنے پلنگ ہیں؟ آپ کو خود بخود حقیقت کا پتہ لگ جاتا۔ بہرحال میں نے بھی ناراضگی سے انہیں جواب دیا۔ پھر یہ سب لوگ سہروردی صاحب کے ساتھ ہو گئے اور انہوں نے چوہدری صاحب کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا تا کہ مجھے صدارت سے ہٹالیا جائے۔ میں دورے پر میرپور گیا ہوا تھا تو مجھے پتہ لگا کہ میرے ہٹانے کے بارے میں تیاری ہو گئی ہے۔ میں واپس آیا اور چوہدری صاحب سے ملا۔ میں نے کہا کہ میں سنتا ہوں کہ اس قسم کی کوئی بات ہے تو کہنے لگے کہ سردار ابراہیم سے بات کرو۔ یہ بات انہوں نے میرے خلاف پروپیگنڈا سے متاثر ہو کر کہی تھی۔ مجھے بعد میں احساس ہوا کہ یہ بات انہوں نے کیوں کہی۔ میں نے نیک نیتی سے اسی طرح سمجھا کہ ٹھیک بات ہے۔ چنانچہ میں سردار ابراہیم خان کے پاس گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں نے ایسا سنا ہے چوہدری صاحب سے میں نے کہا تھا تو انہوں نے کہا کہ میں آپ سے بات کروں، اگر کوئی بات ہے تو مجھے بتائیں۔ ان کا بچہ جاوید قریب کھڑا تھا۔ وہ چھوٹا تھا۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اس وقت ان کی عادت تھی کہ جاوید کے سر کی جھوٹی سچی قسم کھاتے تھے تو اس پر ہاتھ رکھ کے قسم کھائی اور کہا کہ جاوید کی قسم ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں اور اگر کوئی ہو گی تو

چوہدری صاحب کو اس کا علم ہو گا میرے علم میں نہیں ہے۔ میں پھر چوہدری صاحب کے پاس گیا۔ میرے دل میں تھوڑی سی تلخی بھی تھی کہ اب تو باتیں کچھ صحیح دکھائی دے رہی ہیں۔ چوہدری صاحب کہنے لگے کہ کیا مل لئے ابراہیم خان سے؟ میں نے کہا کہ ہاں میں مل آیا ہوں۔ وہ تو یہ بات کہہ رہے ہیں۔ انہوں نے قسم کھائی ہے کہ انہیں کچھ علم نہیں تو چوہدری صاحب نے غصے سے کہا کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ وہ غلط کہتے ہیں۔ انہوں نے تمہارے ہٹانے کی ساری تیاری کر لی ہے۔ میں نے کہا چوہدری صاحب! آپ ہمارے قائد ہیں۔ آپ کو اتنے پاپڑ بیلنے کی اور اتنی تکلیف کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ کہنے لگے کہ کیوں؟۔ میں نے کہا آپ مجھے ٹیلیفون کر لیتے یا پیام بھیج دیتے کہ تم مستعفی ہو جاؤ۔ میں نے تو کبھی اصرار نہیں کیا کہ مجھے گورنمنٹ ملنی چاہئے۔ یہ تو آپ لوگوں نے خود کہا اور ایک خاص وجہ تھی جس وجہ سے میں وہاں تھا اور وہ وجہ سہروردی کے پرائم منسٹر بنتے ہی ختم ہو گئی تھی۔ کیونکہ انہوں نے کہا تھا کہ میں کشمیر کے لئے پاکستان کو داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ اس لئے آپ کو کیا ضرورت پڑی کہ آپ اتنی تکلیف کریں۔ آپ ابراہیم خان سے، سہروردی صاحب سے اور سب سے مل کر یہ بات کریں۔ جب میں نے یہ بات چوہدری صاحب سے کہی تو ان کے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شاید ان کو محسوس ہوا کہ جتنی باتیں تھیں وہ سب ان کو مغالطہ میں ڈالنے کے لئے کی گئی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ مجھے تو یہ بتایا گیا تھا کہ تم صرف سردار ابراہیم خان کو تسلیم کرتے ہو تو میں نے کہا کہ افسوس ہے کہ اب یہ بات کہنے کا وقت نہیں ہے کہ میں ان باتوں پر آپ کے ساتھ بحث میں الجھوں۔ آپ کو یہ خیال کیسے آ گیا؟ چوہدری صاحب کہنے لگے کہ اب کیا کریں؟۔ مطلب ان کا یہ تھا کہ اس منصوبہ کا کس طرح توڑ کریں اور اس کو کس طرح ترک کریں۔ میں نے انہیں کہا کہ اب اس منصوبے کے متعلق اور کچھ نہیں کرنا ہے سوائے اس کے کہ اس پر عمل در آمد کیا جائے۔ کہنے لگے کیوں؟ میں نے کہا اس لئے کہ اب یہ بات آپ کے شایان شان نہیں ہے کہ ایک تو آپ سب نے مل کر غلط بات کی اور اب اس پر یہ دوسری غلطی ہو گی اور یہ بات آپ کے شایان شان نہیں ہے کہ آپ اب کہیں کہ ہم سے غلطی ہو گئی ہے۔ اب اس فیصلے کو نافذ کرنا چاہئے۔ میں صدارت سے علیحدہ ہو جاؤں گا۔ آپ بے شک اس کی تیاری کریں۔ چوہدری صاحب بڑے پریشان ہوئے اور انہیں اس سے بڑی اذیت پہنچی۔ بہرحال جو بات ہونا تھی وہ ہو گئی۔ میں مظفر آباد چلا گیا اور میں نے جانے کی تیاری کی کہ جب یہ لوگ آئیں تو آ کر اپنی حکومت سنبھالیں۔ انہوں نے ورکنگ کمیٹی کا اجلاس رکھا ہوا تھا چنانچہ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بلایا گیا۔ میں نے وہاں مظفر آباد ورکنگ کمیٹی والوں کا استقبال کیا حالانکہ ہمارے لوگ بہت مشتعل تھے۔ وہ ورکنگ کمیٹی والوں کو شاید وہاں آنے ہی نہ دیتے لیکن میں نے ان سب کو ایسا کرنے سے منع کیا۔ گورنمنٹ ایک امانت ہے۔ یہ ہماری وراثت نہیں ہے کہ جس کے چھن جانے کا ہمیں غم ہو۔ اس میں جھگڑا کرنے کی کیا بات ہے؟ چنانچہ ورکنگ کمیٹی کے لوگ آئے۔ میں نے ان کا استقبال کیا، ان کو ٹھہرایا، ان کی دیکھ بھال کی اور پھر اجلاس ہوا۔ جب

اجلاس ہوا تو وہ مجھے کہنے لگے کہ تم استعفا دو میں نے انہیں کہا کہ میں استعفا تمہیں نہیں دوں گا۔ چونکہ آئین کے مطابق میں جنرل کونسل کے سامنے جواب دہ ہوں۔ ورکنگ کمیٹی کے سامنے نہیں۔ میں نے سردار ابراہیم خان صاحب اور دوسرے ورکروں سے کہا مجھے ابھی تک وہ الفاظ یاد ہیں کہ آپ ایسا کریں کہ اگر آپ کو شک ہو تو آپ ہورنہ میرہ سے دوسو آدمی بلوالیں اور کہیں کہ یہ جنرل کونسل ہے' آپ اس کے ذریعے نیا صدر منتخب کر لیں میں علیحدہ ہو جاؤں گا لیکن موجودہ صورت میں تو آپ اس دستور کی خلاف ورزی کریں گے جو تھوڑا بہت بنا ہوا ہے۔ یہ دستور پھر کبھی نہیں بنے گا۔ میں غیر آئینی بات کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں صدارت چھوڑنے کے لئے تیار ہوں۔ مجھے صدارت کی کوئی پرواہ نہیں لیکن میں ورکنگ کمیٹی کے سامنے استعفا نہیں دوں گا۔ ورکنگ کمیٹی جو چاہے فیصلہ کرے۔ سردار ابراہیم خان صاحب نے بہت اصرار کیا۔ میں نے کہا کہ میں تو صدارت پر اصرار ہی نہیں کرتا۔ بات صرف اتنی ہے کہ آپ غیر آئینی بات کیوں کرتے ہیں۔ آپ کو چاہئے کہ جنرل کونسل کے دوسو آدمی بلالیں وہ آپ بلاشبہ ویسے ہی تیار کر لیں۔ آپ اس طرح کم از کم دنیا کو تو بتا سکیں گے کہ جنرل کونسل نے یہ فیصلہ کیا۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ چنانچہ میں نے استعفا نہیں دیا۔

جب یہ فیصلہ ہو گیا اور میں وہاں سے باہر نکلا تو آگے اس سازش میں شریک ایک لیڈر کھڑے ایک آدمی سے بات کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا کہ میں پاس سے گزر رہا ہوں۔ انہوں نے خوشی سے کہا کہ اس آدمی سے کہو کہ میں نے آج چوہدری غلام عباس سے انتقام لے لیا ہے۔ میں فوراً بات سمجھ گیا کہ انتقام انہوں نے یہ لیا کہ چوہدری صاحب نے مجھے حکومت کا صدر بنایا تو اب چوہدری صاحب کو انہوں نے یہ یقین دلایا ہے کہ میں نے چوہدری صاحب سے بغاوت کی' ان کا احترام نہیں کیا اور انتقام یہ ہے کہ میں نکلنے کے بعد چوہدری صاحب کی مخالفت کروں گا۔ وہ چوہدری صاحب کو میرے متعلق یہ بتا سکیں گے کہ یہ غلط آدمی ہے جس کی آپ ہمیشہ حمایت کرتے رہے ہیں۔ اب محض حکومت کی وجہ سے اس نے آپ کی مخالفت کی۔ اللہ تعالیٰ جب رہنمائی کرتے ہیں تو انسان کو فوراً راستہ مل جاتا ہے۔ چوہدری صاحب کی مخالفت تو یوں بھی میرے وہم و گمان میں نہ تھی۔ یہ مجھے خود برا لگتا تھا کہ میں صدارت کی وجہ سے ان کی مخالفت کروں گا۔ صدارت میرا کوئی مقصود نہیں تھا۔ صدارت کی پیشکش تو مجھے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں کی گئی تھی جب سردار ابراہیم خان صدر بنے تھے بلکہ کچھ لوگوں نے اس پر اصرار بھی کیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ میں میدان جہاد چھوڑ کے ادھر آ کے نہیں بیٹھ سکتا۔ اس شخص سے جب میں نے یہ بات سنی تو میرے خیال کو اور بھی تقویت ملی اور میں نے دل میں سوچا کہ ہم آپ کی یہ سازش کبھی کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ چنانچہ میں نے واپس جا کر چوہدری صاحب کو ایک خط لکھا جو شاید اب تک ریکارڈ میں ہو گا' جس میں میں نے انہیں کہا کہ اگرچہ یہ ٹھیک نہیں ہوا لیکن میری آپ کے ساتھ اور جماعت کے ساتھ جو وفاداری ہے' اس کا دارومدار ان باتوں پر نہیں تھا۔ یہ باتیں تو ضمناً درمیان میں آ گئی ہیں۔ صدارتیں اور وزارتیں

میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ میں انشاءاللہ جماعت کے ساتھ اسی طرح وابستہ رہوں گا۔ آپ مجھ پر پوری طرح اعتماد کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اگلے دن سہروردی کا ٹیلیفون آیا۔ چیف سیکرٹری نے کہا کہ سہروردی بات کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ٹیلیفون پر بات کراؤ تو معاملہ ٹھیک ہو جائے گا تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا صدارت کا معاملہ ٹھیک کرنا چاہتے ہیں؟ انہوں نے کہا ہاں ہاں، بالکل وہی ٹھیک کرنا چاہتے ہیں۔ ابھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے کہا اس کے لئے میں ان سے نہیں بات کرتا۔ کوئی اور بات ہے تو بات کرنے کو تیار ہوں۔ میں صدارت کے معاملے میں بات نہیں کرتا۔ اس کے بعد سکندر مرزا کا فون آیا تو انہوں نے پوچھا کہ کیا ہے؟ میں نے کہا یہ صورت ہے، تو انہوں نے کہا کہ میں وزیراعظم سے بات کروں۔ مجھے فوراً محسوس ہوا کہ وزیراعظم شاید نہ مانیں تو ان کے درمیان تلخی ہو جائے گی......

تو میں نے انہیں بھی یہی کہا کہ جی نہیں! یہ معاملہ طے ہو گیا اور میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے آپ کے اور وزیراعظم کے درمیان کوئی تلخی ہو۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے ٹیلیفون پر بڑی باتیں کیں اور مجھے کہا کہ تم وہاں سے فارغ ہو کر مجھے ملو اور ہم دوست رہیں گے وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال ان کے ساتھ تو ہماری دوستی قائم رہی۔ یہ تھا وہ ۱۹۵۶ء کی صدارت کا آزمائشی مرحلہ۔ اس کی تفصیلات تو بہت ہیں۔ اب وہ تفصیلات تو مجھے یاد نہیں۔ میرے ذہن میں یہ اس کے نمایاں پہلو تھے۔ اسی حکومت اور صدارت پر چوہدری صاحب کے اختلافات ہوتے رہے۔ میر واعظ صاحب اور دوسرے لوگوں کے اختلافات ہوتے رہے لیکن اللہ کے فضل و کرم سے اس بنیاد پر رئیس الاحرار سے میرا کوئی اختلاف نہیں ہوا۔

چونکہ ۱۹۵۶ء کے اس واقعہ میں بہت سے باریک سیاسی پہلو ہیں، اس لئے میں نے اس کا تفصیلاً ذکر کرنا ضروری سمجھا تا کہ سیاستدانوں اور سیاست کرنے کے خواہشمند نوجوانوں کو یہ محسوس ہو کہ ہم لوگ جو اس مرتبے پر پہنچے ہیں تو کسی حادثے سے نہیں پہنچے بلکہ اس کے لئے ہمیں بڑے پاپڑ بیلنا پڑے ہیں اور جگر خون کرنا پڑا ہے۔ اپنی جوانی کے جذبات کو ایک طرف رکھ کر قومی معاملات پر سوچنا پڑا ہے جو خاصی محنت اور ایثار طلب مشق ہے۔

آل پارٹیز کانفرنس

ایک آل پارٹیز کانفرنس چودھری محمد علی مرحوم نے بلائی تھی اور دوسری چودھری غلام عباس مرحوم نے بعد میں بلائی تھی۔ جو آل پارٹیز کانفرنس چودھری محمد علی مرحوم نے بلائی تھی، وہ انہوں نے کشمیر کے مسئلہ پر قومی نقطۂ نظر قائم کرنے کیلئے بلائی تھی۔ کانفرنس بلانے سے پہلے انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا تھا۔ اس بات کی ضرورت بھی تھی کہ اس مسئلہ پر ایک قومی نقطۂ نظر مہیا کیا جائے۔ انہوں نے یہ

کانفرنس خوشی سے بلائی تھی۔ یہ واقعی ایک بڑا اچھا قدم تھا۔ غالباً یہ واحد کانفرنس تھی جو حکومت پاکستان کی طرف سے اس سارے عرصہ میں اتنے بڑے پیمانے پر بلائی گئی تھی۔ اس کانفرنس میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ دین محمد کو ایڈوائیزر مقرر کیا جائے تاکہ وہ کشمیر کی تحریک آزادی کو منظم کرنے کیلئے کام کریں۔

ایوب خان اور مسلم کانفرنس

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم جب بر سر اقتدار آئے تو اس وقت آزاد کشمیر میں سردار ابراہیم خان صاحب کی حکومت تھی۔ اس وقت اس کو بدلنے کے لئے ہم نے بھی زور لگایا اور لوگوں نے بھی زور لگایا۔ فیلڈ مارشل بھی سردار ابراہیم خان صاحب کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ بہر حال فیلڈ مارشل مرحوم کے دور میں بعد میں ہم تھوڑی دیر کے لئے قید ہو گئے۔ فیلڈ مارشل مرحوم نے آزاد حکومت تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے چودھری صاحب مرحوم کو حکومت بنانے کی پیشکش بھی کی اور بالآخر چودھری صاحب کے مشورہ سے صدارت کیلئے کرنل عدالت خان کا نام اور دو تین اور نام زیر بحث تھے۔ ان میں میرا نام اور کے ایچ خورشید کا نام بھی زیر بحث تھا۔ میں نے بوجوہ اس سے انکار کیا۔ میرے دل میں فیلڈ مارشل مرحوم کے خلاف بڑی تلخی تھی میں نے سوچا کہ اگر میں نے ان کی مرضی کے خلاف کام کیا تو ایک اور ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا اور فساد پیدا ہو جائے گا۔ ان دنوں مارشل لاء لگا ہوا تھا اور ہم قید سے نئے نئے ہی رہا ہوئے تھے۔ میں نے باہر آتے ہی مارشل لاء کی مخالفت کی۔ میں نے کہا کہ ہم تو مارشل لاء کو نہیں مانتے۔ اس طرح ہمارے درمیان بڑی تلخیاں تھیں۔

مجھے یاد نہیں رہا کہ کرنل عدالت خان کے بارے میں کیا بات ہوئی تھی، لیکن یہ طے ہوا تھا کہ کے۔ ایچ خورشید کو صدر بنایا جائے۔ غالباً اس میں محترمہ فاطمہ جناح کے بارے میں بھی حکومت کو یہ خیال ہو گا کہ خورشید ان کے بہت قریب ہے۔ اس لئے یہ اچھا رہے گا۔ شہاب صاحب مرحوم نے بھی اس میں خاصا کردار ادا کیا۔ خود چودھری صاحب کی بھی خواہش تھی کہ خورشید صاحب کو موقع دیا جائے۔ چنانچہ ہم سب کی معاونت سے خورشید صاحب کو ابراہیم خان صاحب کی جگہ صدر بنایا گیا۔ جب خورشید صاحب صدر ہو گئے تو انہوں نے جلد ہی چودھری صاحب کی مخالفت شروع کر دی۔ میں نے خورشید صاحب سے کہا کہ آپ اور جو چاہیں کریں لیکن چودھری صاحب کی مخالفت نہ کریں۔ اگر چہ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ واہی تباہی کریں یہ کہنے سے مراد یہ تھی کہ وہ جو سیاست چاہیں کریں مگر چودھری صاحب کی مخالفت نہ کریں کیونکہ اس سے اس قدر اختلافات بڑھنے کا خطرہ تھا جنہیں پھر ہم سمیٹ نہ سکتے، البتہ میرے ساتھ یا کسی اور کے ساتھ ان کے اختلافات ہوں تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں ہے، لیکن خورشید صاحب نے چودھری صاحب کی مخالفت سے ہی کام کا آغاز کیا۔ ان کے دل میں شاید پہلے بھی چودھری صاحب کے



شیخ عبداللہ کا آزاد کشمیر میں استقبال

لئے کوئی نرم گوشہ نہیں تھا جیسا کہ بعد کے واقعات سے پتہ چلا' ورنہ چودھری صاحب نے ان کے صدر بنانے میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اگر چودھری صاحب انکار کر دیتے تو خورشید صاحب صدر نہیں بن سکتے تھے۔ لیکن چودھری صاحب آخری دم تک خورشید صاحب کی عزت کرتے رہے۔ جہاں تک چودھری صاحب کی شخصیت کا تعلق ہے تو سارے صدر ملا کے بھی ان کی حیثیت کو نہیں پہنچتے۔ چودھری صاحب کے ساتھ خورشید صاحب کی مخالفت کے باعث پھر حکومت کے ساتھ بھی ہمارا اختلاف ہو گیا۔ فیلڈ مارشل سمجھتے تھے کہ خورشید لوگوں کا نمائندہ ہے اور ہم لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں اور اسے خواہ مخواہ تنگ کرتے ہیں اور یہ کہ ہم اس کو کام نہیں کرنے دینا چاہتے۔ اس تاثر کی وجہ سے چودھری صاحب کے ساتھ بھی فیلڈ مارشل کے اختلافات ہو گئے۔ پھر وہ اختلافات سنگین نوعیت اختیار کرتے گئے۔ یہ بھی ایک لمبی داستان ہے۔ یہ اختلافات بدستور جاری رہے تا آنکہ جبرالٹر آپریشن ہوا۔ مظفر آباد میں جب اس آپریشن کی خبر آئی تو میں نے مظفر آباد میں پبلک جلسہ میں کہا کہ ہم بلا شرط فیلڈ مارشل کے اس ایکشن کی حمایت کرتے ہیں۔ ہمارے جو اختلافات ان سے ہیں وہ ایسے نہیں ہیں کہ ہم اس معاملے میں ان کی مخالفت کریں۔ قائد ملت نے بھی ریڈیو پر تقریر کی۔ چنانچہ اس سے ہمارے اختلافات کم ہونے شروع ہو گئے اور شیخ عبداللہ کے پاکستان آنے پر پھر ہمارے یہ اختلافات رفتہ رفتہ ختم ہو گئے۔ میں باہر انگلینڈ بھی گیا اور میرے بعد فیلڈ مارشل نے بھی باہر جانا تھا۔ میں نے ان کے دورے کے نقطۂ نظر سے وہاں بات کی۔ وہ ایک علیحدہ داستان ہے تو اس طرح فیلڈ مارشل کے ساتھ ہمارے اختلافات ختم ہو گئے تھے۔

ایوب خان اور خود مختار کشمیر اور بھٹو

امر واقعہ یہ ہے کہ کچھ عناصر نے فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں مرحوم کو یہ یقین دلایا تھا کہ آزاد کشمیر کو اگر ایک خود مختار علیحدہ مملکت تسلیم کر لیا جائے' جس طرح باقی دنیا میں خود مختار مملکتیں ہیں اور اسے دوسری حکومتوں سے تسلیم کروایا جائے تو آزاد کشمیر کے لوگ خود پاکستان کی چشم پوشی سے یا ان کی امداد سے یا کسی اور ملک کی امداد سے آزادی کی تحریک چلا سکتے ہیں اور اس کا مقبوضہ کشمیر پر بھی بڑا اثر ہو گا۔ وہاں بھی بھارت کے خلاف خود مختاری کی تحریک چل پڑے گی اور بھارت اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ چونکہ بھارتی حکومت ہی بہت حد تک خود مختاری کی تحریک سے ڈرتی رہی ہے اور انہوں نے نہیں چاہا کہ مقبوضہ کشمیر میں خومختاری کی تحریک چلے۔ ان کی خواہش تھی کہ اگر یہ تحریک چلے بھی تو پاکستان کی طرف چلے' بھارت کی طرف نہ چلے۔ اس میں ان کو کامیابی بھی ہوئی۔ بدقسمتی سے وہ تحریک یہیں چلی۔ وہاں نہیں چل سکی۔ لہٰذا فیلڈ مارشل نے کہا کہ ہاں یہی ٹھیک ہے۔ اس میں منظور قادر کا دماغ



ذوالفقار علی بھٹو، ایوب خاں، شیخ محمد عبداللہ، محمد افضل بیگ

بھی شامل تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ خورشید صاحب کی طبیعت اور مزاج بھی غالباً کچھ اس قسم کا تھا۔ چنانچہ فیلڈ مارشل نے ایک آئینی مشیر مقرر کر دیا جس کی بہت بھاری تنخواہ مقرر تھی 'اسے وزارت امور کشمیر میں بٹھا دیا گیا۔ اس کا کام یہ جائزہ لینا تھا کہ آزاد کشمیر کو کیسے خود مختار تسلیم کیا جائے۔ جب یہ تحریک چلی تو ہم نے اس کی مخالفت کی کہ اس سے سارا مسئلہ کشمیر ہی خراب ہو جائے گا بلکہ ختم ہو جائے گا۔ اس سے ہماری بین الاقوامی ساکھ ہی خراب ہو جائے گی اور بھارت کو اس سے براہ راست فائدہ پہنچے گا۔ ہم نے اس پر آرٹیکل بھی لکھا تھا۔

اتفاق کی بات یہ ہے کہ خود مختاری کے حق میں جب بات کی جاتی تھی تو اس طرح نہیں کی جاتی تھی کہ ہم کشمیر کو آزاد کروائیں گے' یا کشمیر کی آزادی کی تحریک لائیں گے بلکہ بات شکایتاً یہ کی جاتی تھی کہ وزارت امور کشمیر اور حکومت پاکستان سے جان چھڑانے کا راستہ یہی ہے اور حکومت پاکستان نے ہمارے ساتھ یہ کیا اور حکومت پاکستان نے ہمارے ساتھ وہ کیا۔ فلاں افسر یہ کر گیا اور فلاں افسر وہ کر گیا۔ نوجوانوں میں پاکستان کے خلاف اس طرح کا زہریلا پروپیگنڈا کیا جاتا تھا۔ پھر ہم نے پہلی مرتبہ حکومت کے ذریعہ لوگوں کو یہ سمجھایا کہ حکومت کی کارکردگی دوسری چیز ہے اور ملک کا معاملہ بالکل دوسرا معاملہ ہے۔ حکومت اور ریاست دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں ان کو ایک ہی نہیں سمجھنا چاہئے اور اس ملک میں غالباً ہم ہی لوگ ہیں، جنھوں نے سیاست میں اس فلسفے کو اجاگر کیا۔ خدا کے فضل سے ہماری اس کوشش کا اثر آج تک موجود ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد حکومت پاکستان کو بھی احساس ہوا کہ یہ بڑی غلط فہمی اور غلطی تھی اور وہ اس سونے کی چھری کو اپنے ہی پیٹ میں گھونپ رہے تھے۔ اس کے بعد جب شیخ عبداللہ پاکستان آئے تو حکومت نے خورشید صاحب کو قید بھی کیا۔ اس طرح اس وقت آزاد کشمیر کو خود مختار ریاست تسلیم کرنے کی تحریک کا راستہ رک گیا۔

بھٹو کے دور میں تو ان کے ساتھ ہماری بار بار ملاقاتیں ہوئیں اور بھٹو کے کہنے پر فارن آفس کے ساتھ میری بڑی طویل ملاقاتیں ہوئیں۔ اس کے بعد پھر بھٹو نے کشمیر پر خود بھی ایک بڑی اعلیٰ سطحی کانفرنس بلوائی۔ اس میں خورشید صاحب سے بڑے غصے میں کہا کہ "خورشید تم آگ سے کھیل رہے ہو"۔ اس طرح بھٹو نے خورشید صاحب کی حمایت سے ہاتھ اٹھالیا۔ مگر شاید بھٹو کے پیش نظر اس کی حمایت نہ کرنے کے اسباب وہ نہ ہوں جو ہمارے پیش نظر تھے۔ ان کے ذہن میں غالباً اس وقت یہ بات آ گئی ہو گی کہ خود مختاری کے بجائے اس کو صوبہ بنا دیا جائے وہ شاید اس لئے اس کو ناپسند کرتے تھے' ورنہ بھٹو صاحب کے حکومت کے ایک دور میں اس نقطہ نظر کی پذیرائی ہوتی رہی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ خورشید میرے دوست ہیں اس وجہ سے بھی شاید اس مؤقف کے ساتھ ان کی ایک ہمدردی ہو جاتی ہو۔

۱۹۶۵ء کی جنگ

اتفاق کی بات ہے کہ میرے پاس اس جائزے کی نقل نہیں ہے جو میں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے فوراً بعد کوئی ۳۰/۴۰ صفحے پر مشتمل ایک مطالعاتی نوٹ لکھا تھا۔ یقیناً جی۔ ایچ۔ کیو میں ہو گا۔ اس پر بعد میں فیلڈ مارشل ایوب صاحب نے چاہا تھا کہ اس پر میرے 'ان کے اور کمانڈر انچیف کے مذاکرات ہوں ' مگر سیاسی وجوہات کی بناء پر وہ میٹنگ نہیں ہو سکی تھی۔ گذارش یہ ہے کہ میرے گھر کے قریب ایک کمانڈر کیمپ تھا جہاں آج کل جنگی مشقوں کا سکول ہے۔ وہ کمانڈر کیمپ تھا اس میں ٹریننگ دی جاتی تھی سب سے پہلے شاید مجھے اس کمانڈر کیمپ کی وجہ سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ میں اس وقت سے اس کی مخالفت کر رہا تھا کہ یہ نہ کریں۔ ایک تو یہ کہ محکمہ مال اور پولیس کے ذریعے بھرتی کئے گئے لوگ دو سو یا تین سو یا چار سو روپے کے لالچ میں آپ اتنی سنگین کارروائی کیلئے بھیج رہے ہیں' وہ نہیں ہو سکے گا۔ وہ قابل عمل نہیں ہے۔ یہ کوئی سائیکالوجی نہیں ہے کہ ورک کرے۔ اس کے لئے بڑے جذبے والے اور بڑے مشنری لوگ چاہئیں جو گھروں سے بخش بخشوا کے چلیں کہ اب واپس زندہ نہیں آئیں گے۔ ان کو تو علاقے سے بھرتی کئے ہوئے لوگ ملے۔ ہمارے ساتھ وہ بات نہیں کرنا چاہتے تھے چونکہ سیاسی ناراضگی تھی ہم سب کے ساتھ اس وقت بڑی تلخی تھی۔ بدقسمتی سے اس کا انجام وہی ہوا جس کا ہمیں اندیشہ تھا لیکن میں نے اس ناراضگی کے باوجود تمام متعلقہ جنرلوں کو جو اس میں شامل تھے' جلسوں میں سراہا اور ان سے اپنی بات کہتا رہا کہ ایسا کریں ایسا نہ کریں۔ نتیجہ اس کا وہی ہوا۔ ہمارے میجر ایوب خان بھی اس وقت شاید کسی بٹالین کی کمانڈ کر رہے تھے۔ یہ بھی اس آپریشن میں شامل تھے۔ اگر ایس۔ ایس۔ جی کے کچھ لوگ ہمت نہ کرتے تو وہ آپریشن سو فیصدی ناکام ہو جاتا۔ جس مفروضے پر وہ آپریشن شروع ہوا تھا' وہ یہ تھا کہ یہ لوگ اندر جائیں گے تو کشمیر میں لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے اور اس طرح وارے نیارے ہو جائیں گے اور پھر فتح ہی فتح ہو جائے گی۔ یہ ایسی بات تھی کہ شیخ چلّی بیچارا یونہی بدنام ہو گیا۔ کشمیر کے کسی قابل ذکر شخص کو علم نہیں تھا کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ مجھے علم نہیں تھا سردار محمد ابراہیم خان کو علم نہیں ' قائد ملت چودھری غلام عباس کو اس کا علم نہیں۔ مقبوضہ کشمیر میں کسی کو علم نہیں۔ سی۔ آئی۔ ڈی کے جو کانسٹیبل اندر جاتے تھے 'اس آپریشن کی منصوبہ بندی ان کی رپورٹوں پر کی گئی۔ وہ کہتے تھے کہ ہم نے سب ٹھیک کر لیا ہے۔ میں نے بار بار کہا کہ کانسٹیبل کی رپورٹ پر اعتبار نہ کریں۔ شاید آپ سوچ رہے ہوں کہ میں ایسے ہی کہہ رہا ہوں۔ امر واقع یہ ہے کہ کانسٹیبل کی رپورٹ پر اس سارے آپریشن کی منصوبہ بندی ہوئی۔ یہ حکمت عملی کیا تھی 'اس کو تو ایک طرف رکھیں۔ میں ابھی اس پر بات نہیں کرنا چاہتا لیکن فیلڈ میں انہوں نے جو حکمت عملی بنائی وہ کانسٹیبل کی رپورٹ پر مبنی تھی کہ فلاں جگہ بغاوت ہو جائے گی 'فلاں جگہ ہو جائے گی

وغیرہ وغیرہ۔ یہ عجیب وغریب تعجب انگیز رپورٹیں انہوں نے مرتب کر کے ان کو دیں اور ان سے کہا کہ کون ہوتا ہے چودھری غلام عباس، سردار قیوم اور شیخ عبداللہ ہم تو کشمیر خود فتح کر لیں گے۔ یہ تھا سارا افسوسناک پہلو اس آپریشن کے پیچھے۔

اب اندر کی جو بات میں آپ سے عرض کروں، آپریشن کے دوران شیخ عبداللہ نے پیغام بھیجا کہ سردار قیوم کو اندر آنے دو۔ میں نے جنرل اختر سے اور باقی لوگوں سے کہا کہ مجھے اندر جانے دو۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ آپ کو کس نے روکا تھا اندر جانے سے؟ امر واقع یہ ہے کہ میں جنگ بندی لائن کے قریب ویسے ہی جلسے کر رہا تھا تو مجھ کو خاص ایلچی بھیج کر بلوایا اور پابند کر دیا گیا کہ تم جنگ بندی لائن کے قریب نہیں جا سکتے اور پھر میں نے ان کی منّت کی کہ بھئی آپریشن کیسے چلے گا جو تمہارے آدمی اندر گئے ہیں۔ یہ آدمی افسر ہیں۔ ان کی پیشانی پر کلمہ نہیں لکھا ہوا ہے۔ انہیں اندر کون جانتا ہے کہ ان پر اعتماد کرے گا کہ یہ پاکستان سے آئے ہیں۔ ایک ماہ تو انہیں اس بات میں لگا کہ یہ آنے والے پاکستانی ہیں یا انڈین آرمی کے لوگ ہیں جو ہمیں دھوکہ دے کر مارنے کو آئے ہیں۔ ایک دو ماہ تک تو یہ کیفیت رہی۔ میں نے کہا کہ مجھے اندر جانے دیں۔ میں وہاں جا کر بیٹھ جاؤں گا۔ آپ میرا نام بھی تبدیل کر دیں۔ مجھے کوئی کریڈٹ بھی نہیں چاہئے، میں وہاں جا کر بیٹھوں گا۔ لاکھوں لوگوں کو اکٹھا کریں گے اور وہاں پر ایک انقلابی حکومت قائم کریں گے اور ان کے خلاف بغاوت کریں گے اور تحریک چلائیں گے۔ میں جب اندر جاؤں گا تو میرے ساتھ تعلق رکھنے والے لوگ سینکڑوں نہیں، ہزاروں لوگ آزاد کشمیر سے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو جائیں گے۔ ویسے ہی وہ اپنا راستہ کھول دیں گے اور اس طرح یہ آپریشن کامیاب ہو جائے گا۔ لیکن انہوں نے اس بات پر بالکل اتفاق نہیں کیا۔ مجھے کہا کہ اچھا تم تیاری کرو ایک بریگیڈ تیار کرو۔ میں نے ریڈیو پر لوگوں کو کہا کہ جہاں جہاں پاکستان میں ہمارے لوگ ہیں وہ واپس آ جائیں۔ آپ یقین کریں کہ بارہ بارہ پندرہ پندرہ ہزار روپے تنخواہ لینے والے لوگ نوکریاں چھوڑ کر جمع ہو گئے۔ ایک بریگیڈ فوج اکٹھی کر کے ہم ٹنکیاری چلے گئے۔ اور وہاں پر جو انچارج تھے انہوں نے ۵ یا ۱۰ دن ٹریننگ دی اور کہا کہ اس کے بعد ان کو میرے ساتھ اندر بھیج دو لیکن اوپر سے حکم آ گیا کہ ہم سردار قیوم اور ان کے آدمیوں کو اپنے ساتھ نہیں ملا سکتے اور ہم اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔ یہ آپریشن سچی بات یہ ہے کہ پاکستان گورنمنٹ اور پاکستان آرمی کے نام پر ایک مذاق تھا بلکہ ایک بدنما دھبّہ۔ لیکن بدقسمتی سے اس ناکامی کی ذمہ داری کشمیریوں پر ڈالی گئی کہ انہوں نے اس آپریشن میں مدد نہیں کی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے مدد نہیں کی تو یہ سینکڑوں لوگ دو ماہ تک کشمیر کے اندر کس طرح بیٹھے رہے۔ یہ تو حسن اتفاق ہے کہ وادی کے لوگ اٹھ کھڑے نہیں ہوئے۔ اگر خدانخواستہ وادی کے لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوتے تو ان کا بھی یہی حشر ہوتا جو راجوری اور دوسرے علاقوں میں اس تحریک کا ساتھ دینے والے لوگوں کا ہوا۔ یعنی ۸۰ ہزار کے



مولانا مودودی، صدر محمد ایوب، چوہدری غلام عباس

قریب لوگوں کو بے وطن ہونا پڑا۔ ان میں سے کچھ تو واپس چلے گئے اور بڑی تعداد میں جو یہاں ہیں ان کی آباد کاری کا ابھی تک کوئی انتظام نہیں ہو سکا۔ اگر بالآخر وادی سے بھی لوگوں کو اسی طرح نکلنا پڑتا تو بھارت وہاں اپنی طرف سے ہندوؤں کو لا کر آباد کرتا اور یوں ان کا مقصد پورا ہو جاتا کہ وہاں آبادی کا تناسب ہی سارا بدل دیا جائے۔ یہ تو محض حادثہ ہوا اور ایک حسن اتفاق ہے کہ وادی کے لوگوں نے اس طرح اس تحریک کا ساتھ نہیں دیا۔ بدقسمتی سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس کی ذمہ داری کشمیریوں کے سر ڈالی گئی، بلکہ بعض لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ ۱۹۶۵ء میں جو یہ آپریشن کیا گیا تھا اس کا مقصد ہی یہی تھا کہ یہ بتایا جائے کہ اس سلسلے میں اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس مسئلہ کو سیز فائر لائن پر ختم کیا جائے۔ چودھری محمد علی مرحوم جو بڑے معروف شخص ہو گذرے ہیں وہ اپنے استدلال اور حسابی اندازوں کی وجہ سے سارے ہندوستان میں منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ وہ ایک عرصہ تک ذاتی طور پر محض اس وجہ سے مجھ سے ناراض رہے۔حتیٰ کہ میرے ساتھ بات چیت بھی نہیں کرتے تھے کہ میں نے ۱۹۶۵ء کے دور میں مرکزی حکومت کا غیر مشروط طور پر کیوں ساتھ دیا۔ پھر ایک دفعہ جب میں نے ان سے اصرار کر کے پوچھا کہ کیا وجہ ہے آپ مجھ سے کیوں ناراض ہیں تو انہوں نے مجھے وہی بات کہی کہ میں نے ۱۹۶۵ء میں کیوں فوج کا ساتھ دیا تھا۔ جب کہ ان کا خیال یہ تھا کہ یہ منصوبہ جن لوگوں نے بنایا تھا ان کی غرض ہی یہی تھی کہ اس منصوبے کو ناکام کر کے وہ یہ ثابت کریں کہ کشمیر کے مسئلے پر کچھ نہیں ہو سکتا لہٰذا اس کو اب ختم کر دیا جائے۔ خیر میں نے تو بہر حال ان کے سامنے وضاحت کی کہ ہمارا ساتھ دینا کتنا ضروری ہے اگر ہم ساتھ نہ دیتے تو معلوم نہیں بھارتی فوجیں کہاں تک چلی آتیں۔

اس طرح یہ ۱۹۶۵ء کے آپریشن کی ناکامی بالکل بلاوجہ کشمیریوں کے کھاتے میں پڑ گئی۔ ورنہ میرے خیال میں یہ ایسا آپریشن ہے جو ہماری تاریخ سے نکال دیا جاتا تو اچھا تھا۔ اس وقت میں نے تاؤبٹ سے لے کر بھمبر تک بلکہ لاہور اور سیالکوٹ کے محاذ تک سارے علاقے کا دورہ کیا تھا۔ کشمیر میں تو ایسے لگتا تھا کہ جیسے اس آپریشن کا منصوبہ بنانے والوں نے یہ سوچا ہے کہ سامنے کوئی قبرستان ہے جس کے خلاف ہم منصوبہ بنا رہے ہیں، ہمارے اس آپریشن کی بالکل کوئی مزاحمت نہیں ہو گی نہ کوئی جواب دیا جائے گا۔

تو یہ تھی صورت حال ۱۹۶۵ء میں آپریشن کے ناکام ہونے کی۔ میرا یقین ہے کہ اگر اس وقت کشمیریوں کو اعتماد میں لیا جاتا، چودھری غلام عباس مرحوم، سردار محمد ابراہیم خان، مسٹر خورشید اور مجھے اس آپریشن میں شریک کر لیا جاتا تو صورت حال بالکل مختلف ہوتی۔لیکن ہوا یہ کہ نہ سیز فائر لائن کے اس طرف کسی کو اعتماد میں لیا گیا اور نہ اس طرف۔ ان حالات میں، ہم کیسے یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ آپریشن کشمیر کے لئے تھا۔ اور اس میں کشمیری ناکام ہو گئے۔

کشمیری حالت جنگ میں ہیں

اس سلسلے میں میرا خیال ہے کہ مستقبل میں شاید آزاد کشمیر ہی ایسا خطہ ہو جہاں لینڈ وار فیئر متوقع ہو سکتی ہے۔ ہم لوگ تو یہاں جتنا کچھ کر رہے ہیں وہ خواہ کسی بھی قسم کی ترقی ہو اور جس کسی سیکٹر میں بھی ہو، اس کا مقصد اصل میں کشمیر کی آزادی اور اس کا پاکستان کے ساتھ الحاق ہے۔ کم از کم جہاں تک ہمارا تعلق ہے، مسلم کانفرنس کے نام سے ہم ہی اس مکتب فکر کے لوگ ہیں۔ ہمارا وہ کام جو ۱۹۳۱ء سے شروع ہوا تھا اور ۱۹۴۷ء میں دوسرے مرحلے میں داخل ہوا، مکمل نہیں ہو سکا۔ وہ کام ۱۹۴۹ء میں آ کر رک گیا۔ اس کے بعد ہماری مسلسل یہ کوشش رہی ہے کہ ہمارا یہ بقیہ کام مکمل ہو جائے اس اعتبار سے اگر آپ غور کریں تو ہم لوگ مسلسل ایک جنگ کی کیفیت میں ہیں۔ چاہے ہم اپنی نا سمجھی سے آنکھیں بند کریں اور یہ سمجھیں کہ ہم جنگ کی حالت میں نہیں ہیں تو یہ اور بات ہے اور اسکا کوئی علاج نہیں ہے۔ لیکن امر واقع یہ ہے کہ ہم سب لوگ جنگ کی حالت میں ہیں اور ہم ایسا ہی سمجھتے ہیں اور اس وجہ سے ہماری ساری کوششوں کا مرکز، آپ شاید اخبارات بھی وقتاً فوقتاً پڑھتے ہوں گے، یہی رہا ہے کہ ہمارا رخ تمام کاموں میں اسی مقصد کی طرف ہو۔

ہماری رائے، ہمارا پختہ یقین تو اس بات پر ہے کہ پاکستان کشمیر کے بغیر مکمل نہیں ہے اور قائد اعظمؒ کا ارشاد جو انہوں نے شروع میں فرمایا تھا بڑا حکیمانہ تھا۔ وہ محض کوئی جذباتی بات نہیں تھی بلکہ وہ جغرافیائی، دفاعی، معاشی، تاریخی اور سماجی ہر اعتبار سے ایک پوری تاریخ ہے اور حقیقت ہے کہ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے اور کوئی باغیرت قوم اپنی شہ رگ کو مستقل طور پر دشمن کے قبضے میں نہیں دے سکتی۔ تو ہم خدا کے فضل و کرم سے اسی فکر کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ اس دوران ہمیں ایسی بڑی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ جن کے پیش نظر ہماری قوم کے بڑے حصے یعنی مشرقی پاکستان کے دس کروڑ مسلمانوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور وہ مشرقی پاکستان کے بجائے بنگلہ دیش بن گیا۔ ہم یہاں آزاد کشمیر میں اس سے ملی جلی صورت حال یا اس سے زیادہ سنگین صورت حال سے دوچار ہیں اور اللہ کی مہربانی سے اس سلسلے میں بھی میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ ہم نے اس صورت حال کا تن تنہا مقابلہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں حکومت پاکستان کی طرف سے یا پاکستان کی سیاسی قیادت کی طرف سے کسی قسم کی کوئی فکری، سیاسی، یا مادی امداد میسر نہیں آئی۔ اس کے باوجود اللہ کا کرم ہے کہ ہم نے اس صورت حال کا بڑی کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ وہ قوتیں جو گذشتہ دس سال کے غیر جمہوری دور کی حکومت کے نتیجہ میں پیدا ہوئی تھیں اور کافی تقویت پکڑ گئی تھیں، وہ آج دفاع پر ہیں اور زیادہ متحرک نہیں ہیں۔ ان کو اپنی حکمت عملی بدلنا پڑی ہے اور ان کی قوّت میں بھی کمی واقع ہوئی ہے۔

دشمن کاخطرناک منصوبہ اوراس کامؤثرتوڑ

ایک پہلوتوہماری اس تحریک کایہ ہےاور دوسراپہلویہ ہے کہ انڈیانے جیسے کہ آپ حضرات سب جانتے ہیں اندراگاندھی کے آخری ایام حکومت میں اس بات کی مکمل تیاری کرلی تھی جس کی نشاندھی میں نےاخبارات میں کردی تھی کہ وہ ہم پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہورہے ہیں اور کشمیر کے اندران کی جتنی فوجی تیاری ہے وہ ایسی ہے کہ ان کو کوئی مزید تیاری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگران کی نیت خراب ہو جائے توجو کچھ انہوں نے کیاہواہے وہ کافی ہے تواس پر مختلف لوگوں کے بیانات آئے کہ یہ ایسے ہی خوف وہراس پھیلارہے ہیں۔ بعدمیں پھرپتہ چلا کہ حملے کے لئے وقت بھی مقرر ہوگیاتھا توانفاق سے وہ بات ٹل گئی۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان کی جو سیکورٹی منصوبہ بندی ہے وہ اب تحریر میں آگئی ہے۔ یہ باتیں یقیناً آپ لوگوں کی نظر سے گزری ہوں گی کہ ان کی اس منصوبہ بندی میں ان کی سیکورٹی کی جتنی خرابیاں ہیں یاجتنے نقائص ہیں اور جتنی کمزوریاں ہیں وہ ان سب کاسبب پاکستان کو سمجھتے ہیں۔ گویاپاکستان ہی ان کی ساری خرابیوں کابڑاسبب ہے۔ اس لئے وہ جب تک اس کو ختم نہیں کرتے تب تک وہ آرام سے نہیں بیٹھ سکتے۔ آپ سمجھیں کہ یہ ان کاہدف ہےاور ان کامقصد ہے۔ میرے نقطۂ نظر سے اس مقصد کے حصول کے لئے سب سے آسان طریقہ اور یقینی ذریعہ آزاد کشمیر کاراستہ ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ آزاد کشمیراور شمالی علاقہ جات پر قبضہ کرلیں جو متنازعہ علاقہ ہےاور جس پر کوئی بین الاقوامی جنگ چھڑنے کاخطرہ بھی بظاہر نہیں ہو سکتا، تو ایسی صورت میں پھر وہ بہت آسانی کے ساتھ پاکستان کے خلاف اپنی بقیہ کارروائی بھی کر سکتے ہیں۔ ہمیں تواس میں کوئی شک نہیں اور ہم نے اپنے آپ کو اس خوش فہمی میں کبھی مبتلانہیں رکھاکہ وہ کچھ نہیں کریں گے۔ وہ ہروقت ہربات کرنے کیلئے تیار ہیں۔ البتہ اس کارروائی کیلئے شایدان کو دوباتوں کاانتظار کرنا پڑے۔ ایک تو یہ کہ بین الاقوامی حالات ان کے حق میں ہوں۔ ایسے حالات کہ جن سے وہ محفوظ رہ جائیں اور دوسرایہ کہ خود آزاد کشمیراور کشمیر کے اندر حالات ایسے ہوں جن حالات میں ان کو مزاحمت کی توقع نہ ہو۔ یہی بات انہوں نے مشرقی پاکستان میں بھی کی۔ انہوں نے بین الاقوامی حالات کو بھی ہموار کیااور اندرون ملک بھی جب انہوں نے دیکھا کہ مزاحمت کی تحریک نہیں ہے بلکہ حالات اس کے برعکس ہیں توانہوں نےاس سے استفادہ کیا۔

نظریاتی یکجہتی

اسی حکمت عملی کے پیش نظر ہم یہ کوشش کررہے ہیں کہ سب سے پہلے پورے آزاد کشمیر کے اندر نظریاتی یکجہتی ہواور لوگ اس بات کے لئے پوری طرح تیار ہوں کہ فوج ہو یانہ ہو۔ ہم نے خود اس سرزمین



سردار قیوم اور جنرل محمد ضیاء الحق

کے ایک ایک انچ کا دفاع کرنا ہے 'اس کے لئے لڑنا ہے اور اس پر مرنا ہے۔ مرد 'عورت 'بوڑھا 'بچہ سب لڑیں گے اور مریں گے اور یہ حالات سو فیصدی اس طرح کے نہیں جس طرح کہ گذشتہ دس سال کے دوران تھے۔ اس عرصے میں بڑی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں۔ ان کا ذکر کرنا لا حاصل ہے مگر خدا کے فضل سے میں ایسا کہہ سکتا ہوں کہ نصف سے زائد یعنی پچاس فیصد سے زائد ہم یہ میدان سر کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ تو ہم یہاں وہ صورت حال پیدا کرنا چاہتے ہیں اور اگر ایسا ہو جائے تو یہ ۲۰ '۲۵ لاکھ آدمی ہیں اور یہ سب پہاڑ کے رہنے والے لوگ ہیں۔ جنہوں نے ۱۹۴۷ء میں ۱۵ ماہ تک جنگ لڑی ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ایسی مثالیں شاید ہی ملتی ہوں۔ قرآن کریم میں خداوند کریم نے کہا ہے کہ..........

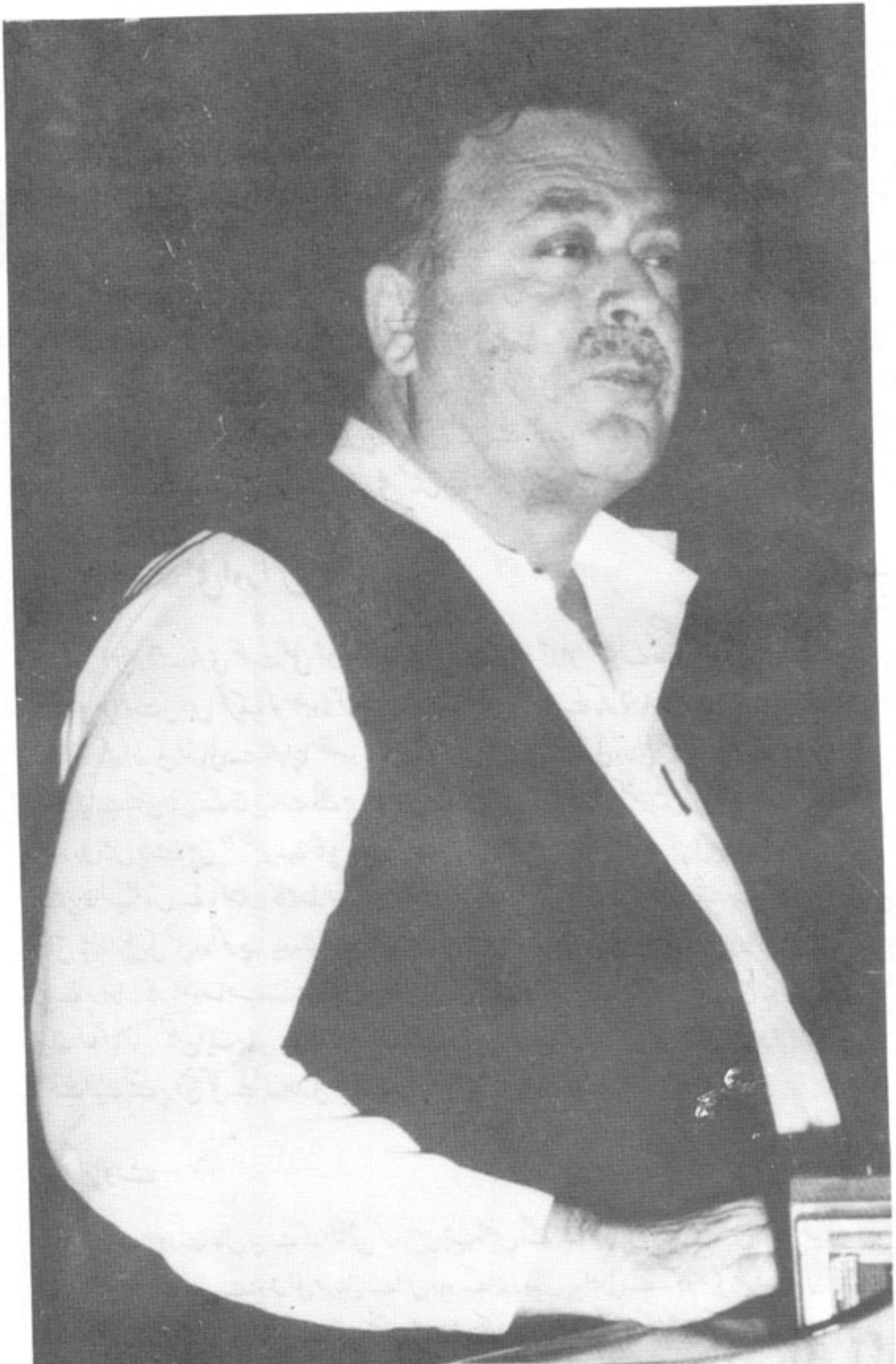
"كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ "

(کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ تھوڑے لوگ زیادہ لوگوں پر اللہ کے حکم سے غلبہ حاصل کرتے ہیں)۔

مگر ہم نے ۱۹۴۷ء میں خود اس کا مظاہرہ یہاں دیکھا ہے۔ ہم ۱۵ ماہ لڑے ہیں اور ایک سیکٹر ایسا تھا جس کی میں خود کمان کر رہا تھا۔ اس اعتبار سے یہ کوئی ۲۰/۲۵ لاکھ لوگ ہیں۔ اگر ان کا عزم ٹھیک ہو جائے 'یہ تیار ہو جائیں تو آزاد کشمیر پر حملہ کی صورت میں پہلی مؤثر مزاحمت یہی لوگ ہیں۔ اس کی یہ وجہ بھی ہے کہ آزاد کشمیر میں بڑی تعداد میں فوج سے ریٹائرڈ لوگ بھی موجود ہیں۔ آپ تو یہ بات بخوبی سمجھتے ہیں کہ اگر انڈیا پاکستان کے ساتھ کوئی بھی لڑائی لڑنا چاہے گا تو اس کو مختصر رکھنا چاہے گا وہ لمبی لڑائی لڑنے کی استعداد بھی نہیں رکھتا اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا۔ وہ ہفتہ دس دن کے اندر اس پر قبضہ کرنا چاہے گا لیکن آزاد کشمیر کے اگر ۲۰/۲۵ لاکھ لوگ مزاحمت کیلئے تیار ہو جائیں تو پھر وہ ہفتہ دس دن کی لڑائی مین قبضہ کی بات بالکل ناممکن ہو جائے گی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا بلکہ یہ لڑائی مہینوں اور سالوں تک پھیل سکتی ہے جس کا بھارت متحمل نہیں ہو سکتا' پاکستان اور نہ ہی بین الاقوامی صورت حال 'لیکن اگر اس کے ساتھ مقبوضہ کشمیر کے لوگ بھی اس مزاحمت میں ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں تو شاید ہندوستان کے لئے حملہ کرنے کا ایک فیصد امکان بھی نہیں رہتا سوائے اس کے کہ وہ پاگل ہو جائیں اور دیوانگی اور جنون کے عالم میں اندرونی پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کیلئے کوئی ایسا اقدام کرنا چاہیں تو یہ اور بات ہے۔

آزاد کشمیر میں تعمیر و ترقی

آزاد کشمیر میں ۱۹۷۰ء میں جب میں صدر بنا تو میں نے ترقیاتی شعبہ قائم کیا تھا۔ اس سے پہلے یہ شعبہ سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ یہ جو میں نے عرض کیا کہ ہم آگے ہیں تو وہ ۱۹۷۰ء سے بعد کا کارنامہ



سردار سکندر حیات خان

ہے۔ اس سے پہلے کچھ نہ تھا۔ بلکہ میں ۱۹۷۰ء میں صدر بنا تو مظفر آباد کے پورے ضلع میں لڑکیوں کے صرف پانچ پرائمری سکول تھے۔ آج اللہ کے فضل سے کالج ہیں' ہائی سکول ہیں اور بہت کچھ ہے۔ یہ ہم نے اس تھوڑے پیسے کو ٹھیک طریقہ سے صحیح استعمال کیا اور کام کیا ہے۔ سڑکیں یہاں ہم ۲۰ ہزار روپے فی میل بناتے ہیں جو سڑک ہم یہاں ۲۰ ہزار روپے فی میل بناتے ہیں وہ پنجاب کے میدان میں دو لاکھ روپے سے بنتی ہے۔ تو یہ لوگوں نے خود بھی محنت کی اور کوشش کی جس کے نتیجہ میں خود سکول کھولے۔ سالہا سال تک خود چلاتے رہے۔ عمارتیں بھی خود بناتے ہیں تو اس طرح یہ مل کر ترقی ہوئی ہے۔ میں نے فنڈز کی بات کی ہے جو فنڈز ہمیں ملنے چاہئیں یعنی صوبوں کے ساتھ مرکزی گورنمنٹ کا فنڈز ملنے کا جو تناسب ہے۔ جس جس ذریعے سے ملتے ہیں وہ ہمیں پوری طرح نہیں ملتے' اور یہ ہم ان سے کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ یہ فنڈز کسی گرداب میں پھنس جاتے ہیں اور پھر نہیں ملتے۔

ہماری حکمت عملی اور اس کا اثر

اس وقت ہماری حکمت عملی آزاد کشمیر میں یہی ہے کہ ہم آزاد کشمیر کے علاوہ مقبوضہ کشمیر کے اندر بھی مزاحمت کی اس تحریک کو مضبوط کریں اور خدا کے فضل و کرم سے کچھ تو ہمارے تھوڑا بہت کرنے سے اور کچھ اللہ کی مہربانی سے ہم اپنا مقصود پالیں گے۔ یہ کہنے میں مجھے کوئی دریغ نہیں کہ ہم نے کام تو تھوڑا کیا ہے لیکن اس کے نتائج بہت نکلے ہیں اور اس کے نتیجہ میں آج مقبوضہ کشمیر میں بھی' جیسا کہ آپ اخباروں میں پڑھتے ہیں ''کشمیر بنے گا پاکستان'' کے نعرے لگتے ہیں۔ ۱۴؍ اگست کو ہری پربت کے فوجی قلعے پر طالب علموں نے پاکستان کا جھنڈا لہرایا اور ابھی جو ہمارے وزیر اعظم' سردار سکندر حیات خان نے یوم یکجہتی کیلئے اپیل کی تھی وہ اگرچہ زیادہ تر آزاد کشمیر کیلئے تھی لیکن مقبوضہ کشمیر میں بھی اس پر عمل ہوا اور بڑے پیمانے پر ہوا۔ پھر بھٹو صاحب نے جو ہڑتال کی اپیل کی تھی آپ کو معلوم ہے کہ اس پر بھی وسیع پیمانے پر لبیک کہا گیا تھا۔ لیکن ایک سال سے زائد عرصہ کے اندر خاص طور پر مقبوضہ کشمیر میں ساری نقل و حرکت یکلخت ایسے نقطے پر پہنچ گئی ہے کہ بھارتی حکومت وہاں الیکشن نہیں کروا سکتی۔

نئی کروٹ

اب صورت حال یہ ہے کہ الیکشن کروائیں تب پھنس گئے' نہ کروائیں تب بھی پھنس گئے۔ یہ ایک خاص صورت حال ہے جو خدا کی مہربانی سے اس دور کے اندر وہاں پیدا ہوئی ہے۔ دوسری طرف یہاں آزاد کشمیر میں عرصہ ڈیڑھ سال سے ایک منتخب جمہوری حکومت قائم ہے۔ ابھی گذشتہ دنوں ایک امریکی سفارت خانے کا ایک ایڈوائیزر یہاں آیا تو مجھے پوچھنے لگا کہ مسٹر پریذیڈنٹ! تم نے ادھر کیا کیا کہ ایک سال

کے اندر مسئلہ کشمیر جو اپنی اہمیت کھو چکا تھا بلکہ یہ مسئلہ کہیں تھا ہی نہیں ' صرف کاغذوں میں اس کا ذکر آتا تھا۔ اب وہ پھر از سر نو زندہ ہو گیا ہے۔ ایک سال کے اندر اندر تم نے کیا کیا ہے؟ میں نے کہا کہ ایک سال میں ہم نے بہت کچھ تو نہیں کیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم نے کچھ نہیں کیا۔ لیکن چونکہ ہم Committed لوگ ہیں اور ہماری اس Commitment کے بارے میں دوست و دشمن کسی کو شک نہیں اس کو سب اچھی طرح جانتے ہیں۔ حکومت پاکستان اور لوگوں کو بھی پتہ ہے۔ اس لئے ہماری Commitment کی وجہ سے یہ مسئلہ خود جاگ اٹھا ہے۔ اب البتہ ہم کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں لیکن وہ اتنا نہیں ہے۔ جس سے یہ مسئلہ اس قدر زندہ ہوا ہے۔

تو گزارش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہماری حکمت عملی یہ ہے کہ ہم مزاحمت کی اس تحریک کو سرحد کے دونوں جانب قائم کریں اور اس بات کی کوشش کریں کہ جنوبی ایشیاء میں مجموعی طور پر جو صورتحال پیدا ہوئی ہے اور بھارت کے اندر قیادت کی کمزوری کے نتیجے میں جو حالت پیدا ہوئی ہے ' اس کے نتیجے میں جو تحریکیں وہاں چل رہی ہیں اس کا ہم استفادہ کر کے کسی اور موقع پر ایسے مقام پر پہنچیں جہاں کشمیر کے مسئلہ کا کوئی حل واضح ہونا شروع ہو جائے۔

جنگ کیلئے مناسب میدان

جہاں تک لینڈ وار فیئر کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ اگر انڈیا کے ساتھ جنگ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو تو میں کشمیر کا گراؤنڈ ہی منتخب کروں گا کہ اس سے بہتر کوئی گراؤنڈ نہیں ہے جس پر ہم انڈیا کے ساتھ پوری طرح جم کر تسلی کے ساتھ لڑ سکتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس قسم کا یہ علاقہ ہے۔ پہاڑ ' دریا ' جنگل ' لوگ ' تو یہ ساری چیزیں ہمارے حق میں ہیں۔

اسلامی تشخص

اِسلامی تشخّص کے متعلق ایک بات جو میں آپ حضرات سے کہنا چاہوں گا وہ یہ ہے کہ پاکستان کا وجود مسلسل انڈیا کے دباؤ کے نیچے ہے۔ وہ دباؤ انہوں نے کبھی چھوڑا نہیں ہے اور نہ کم کیا ہے۔ وہ اخلاقی دباؤ ہو ' اقتصادی ہو یا فوجی ہو ' جس میدان میں بھی ہو۔ انہوں نے اس کو کبھی کم نہیں کیا اور یہ دباؤ مسلسل جاری رہے گا اور یہ بات بھی ہمیں معلوم ہے کہ مادی اعتبار سے ہمارے لئے ان سے مقابلہ کرنا کسی صورت ممکن نہیں ہے ان کے ذرائع ان کے وسائل ساری چیزیں ہمارے مقابل میں اتنی بڑی ہیں کہ اس کا مقابلہ اس طرح نہیں ہو سکتا۔ وہ مقابلہ اگر ہو سکتا ہے اور کامیابی سے ہو سکتا ہے تو وہ

ایک ہی صورت سے ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے تشخّص کو بالکل واضح کریں۔ نمایاں کریں کہ کسی کو ہمارے بارے میں شک نہ ہو۔ صرف فنی مہارت پر ہی انحصار نہ کریں بلکہ ہم اپنے کردار میں وہ بات پیدا کریں۔ کردار کی بات میں اس لئے کر رہا ہوں کہ کوئی پانچ وقت نماز بھی پڑھے اور یہ کہے کہ وہ کمیونسٹ بھی ہے تو وہ کمیونسٹ ہو نہیں سکتا۔ اس طرح ہر چیز کا ایک تشخّص ہے اور ہر چیز کی ایک حیثیت ہے جسے قائم رکھنا ہوتا ہے۔ ہم لوگ اگر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں 'اسلام کے نام پر لڑیں گے جہاد کریں گے تو انڈیا کے ساتھ اگر کوئی لڑائی ہو تو وہ ہماری طرف سے جہاد ہونا چاہئے۔ یہ لڑائی نہ ہو' جہاد ہو۔ لڑائی ان کی طرف سے ہونی چاہئے۔ لیکن یہ تب ہو سکتا ہے کہ ہمارے کردار سے وہ بات معلوم ہوتی ہو کہ وہ بات ہمارے کردار میں شامل ہے۔ یہ بات محض فنی فتویٰ دینے سے نہیں ہو جائے گی کہ کسی مولوی نے لکھ دیا کہ جہاد ہو رہا ہے لہٰذا جہاد ہو گیا۔ جہاد اس سے نہیں ہو گا بلکہ وہ چیز نمایاں ہونی چاہئے کہ ہم پاکستانی ہیں اور پاکستان میں اسلام کے ساتھ وابستگی رکھتے ہیں اور اس وجہ سے .... وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ کے مطابق خدائے تعالیٰ کی وہ امداد جس کا مسلمانوں اور مومنین کے ساتھ وعدہ ہے' آ کر رہے گی۔

پاکستان اور کشمیر کا اندرونی اتحاد

آپ کسی بھی ملک کی مثال لیں۔کسی ملک کے اندرونی حالات میں تب تک استحکام نہیں ہو گا جب تک وہاں کوئی بنیادی اور اساسی جماعت مضبوط نہیں ہو گی۔ انڈیا میں اگر استحکام ہے تو کانگریس کی وجہ سے ہے کہ وہ اساسی پارٹی ہے۔ جس دن کانگریس کے ہاتھ سے حکومت چلی گئی جیسا کہ جنتا پارٹی والے چند دن آئے تو آپ نے دیکھا تھا کہ کیا افراتفری پیدا ہو گئی تھی تو پاکستان میں یہی بڑی خامی ہے کہ جو مادر پارٹی ہے اس کی گرفت مضبوط نہیں ہے۔ مشرقی پاکستان میں یہی ہوا۔ اگر مسلم لیگ وہاں مضبوط ہوتی تو مشرقی پاکستان کبھی بنگلہ دیش نہ بنتا۔ پاکستان میں جو افراتفری ہے وہ یہی مادر پارٹی کے مضبوط نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ آزاد کشمیر میں جو استحکام ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہاں جو مادر پارٹی ہے یعنی آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس وہ اس سارے عرصے میں مضبوط رہی ہے۔ ۱۹۳۴ء میں ریاست جموں و کشمیر میں پہلا الیکشن ہوا جس میں مسلمانوں کی ۲۱ سیٹیں تھیں ۲۱ میں سے ۱۶ سیٹیں مسلم کانفرنس نے جیت لیں۔ پھر ایک وقت آیا ۱۹ سیٹیں جیتیں پھر ایک ایسا وقت آیا کہ پوری سیٹیں جیتیں۔ ۱۹۳۴ء سے لے کر ۱۹۸۶ء تک جتنے الیکشن ہوئے ہیں ان سب میں مسلم کانفرنس نے لامحالہ کامیابی حاصل کی اور بڑی واضح کامیابی حاصل کی۔ آزاد کشمیر کے اندر یہ ایک نمایاں خصوصیت ہے۔مسلم کانفرنس کوئی حادثے کی پیداوار نہیں ہے نہ کسی سیاسی مصلحت کی پیداوار ہے۔ بلکہ یہ ایک تاریخی عمل کی پیداوار ہے اور اس نے تاریخی عمل کو قائم رکھا ہوا ہے۔ اس وجہ سے آزاد کشمیر کے اندر پہلی بات تو یہ ہے کہ سیاسی استحکام موجود ہے خواہ جتنی

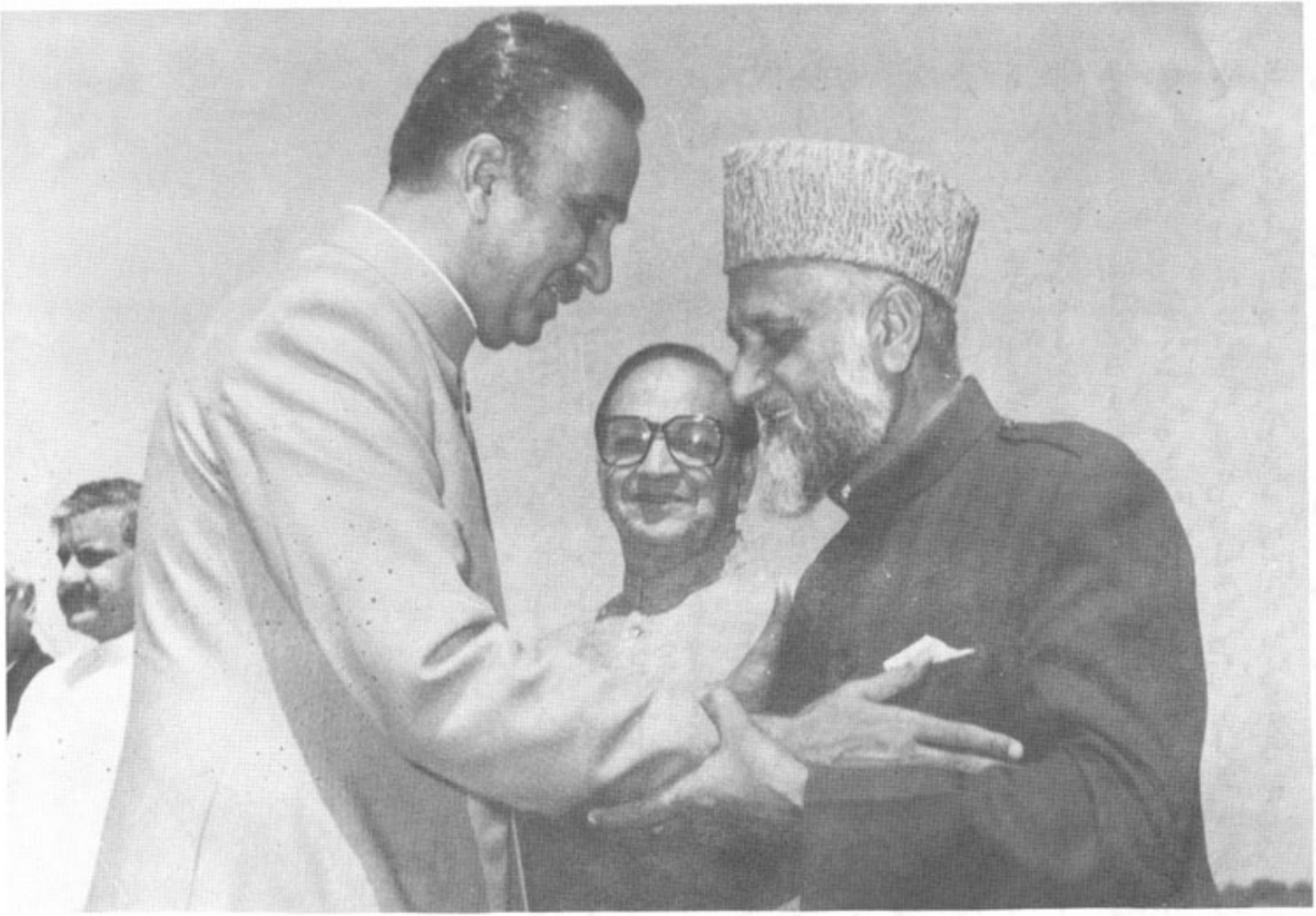


بے نظیر بھٹو

پارٹیاں بھی ہوں ہمارے خلاف ساری پارٹیاں الیکشن میں اکٹھی تھیں ' مذہبی اور سیاسی پارٹیاں لیکن خدا نے ہمیں فتح دی۔ دوسری گذارش یہ ہے کہ ہم مقبوضہ کشمیر کی صورت حال کے پیش نظر ایک نقطہ پر اتحاد کیلئے کوشش کر رہے ہیں اور اگر اتحاد نہ بھی ہو تب بھی اتفاق رائے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم اپنے کردار سے آزاد کشمیر میں دوسری پارٹیوں کے خلاف کچھ نہیں کرتے۔ وہ ہمارے خلاف کر رہے ہیں لیکن ہم سوائے اس کے کہ کبھی کبھی بیانات میں ان کا جواب دے دیتے ہیں۔ ہم نے یہاں آزاد کشمیر کے اندر کسی کے خلاف کارروائی نہیں کی جو کہ پارٹی حکومت کا گویا لازمہ ہے۔ لیکن ہم نے ایسا کرنے سے ہمیشہ اصولاً گریز کیا ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ ہمارے خلاف کوئی مؤثر تحریک نہیں چل سکتی چونکہ لوگ پوچھتے ہیں کہ ہمارے خلاف کیوں تحریک چلا رہے ہو بات کیا ہے۔ جس کی وجہ سے تم ناراضگی کا اظہار کر رہے ہو۔ یہ از خود اتحاد کی طرف ایک مثبت قدم ہے۔

پاکستان اور آزاد کشمیر کا استحکام

یہ بدقسمتی کی بات ہے اور اپنے گھر میں بات کر رہے ہیں اور اس بات کا باہر کوئی اعلان نہیں کر سکتے۔ بات یہ ہے کہ سیاسی جماعتیں اپنا کردار ادا نہیں کر سکیں جس کے باعث ملک میں استحکام نہیں آ سکا۔ مارشل لاء کے دوران تھوڑا بہت حکومت میں استحکام آیا ہے۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ ملک کے اندر جیسا کہ میں نے اپنے بیانات میں کہا تھا کہ اگر سیاستدان اکٹھے ہو کر اس بات پر اتفاق رائے کر لیں کہ ۱۹۹۰ء میں الیکشن ضرور ہوں اور وہ کسی مشترک حکمت عملی کے تحت ہوں تو اس پر اتفاق رائے ہو سکتا تھا۔ لیکن پارٹیوں نے اپنی پارٹی کے وقار کو ملک کے وقار پر مقدّم سمجھنا شروع کر رکھا ہے۔ سیاست میں دو باتیں ہوتی ہیں ایک تو بالکل سیدھی سیاسی بات ہوتی ہے اور ایک تدبّر کی بات ہوتی ہے۔ تدبّر میں پارٹی نہیں آتی فرد نہیں آتا اس میں تو ملک کے مجموعی مفادات آتے ہیں۔ ہمارے ہاں تدبر کم ہو گیا' سیاست زیادہ ہو گئی اور سیاست بازی نے پارٹیوں کے اور شخصی مفادات کو ملک کے مفادات پر مقدّم کر دیا ہے۔ اب سب لوگوں کو اس کا احساس ہو رہا ہے' ورنہ کہتے تھے سردار قیوم حکومت کا ایجنٹ ہے۔ اب سب اپنی جگہ بیٹھ کر کہتے ہیں۔ یہ ٹھیک کہتا ہے۔ شاید ۱۹۹۰ء میں بھی الیکشن نہ ہوں۔ اس لئے مل کر الیکشن کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ اگر ملک میں استحکام نہ ہوا تو ۱۹۹۰ء میں بھی الیکشن نہ ہوں گے اگرچہ جونیجو صاحب اور صدر ضیاء صاحب کہتے تو ہیں لیکن صورت حال تو مکمل طور پر ان کے کنٹرول میں بھی نہیں ہے۔ صدر صاحب کہتے تھے کہ میں ۹۰ دن میں الیکشن کراؤں گا۔ مگر جب صورت حال اور واقعات میں آمنا سامنا ہوا تو انہوں نے کہا کہ الیکشن نہیں کرا سکتا۔ صورت حال تو کسی کے کنٹرول میں نہیں ہے۔ اس لئے یہ لوگ اگر بیٹھ کر قبل از وقت سوچتے کہ ہم مل کر ملک کے اندر جو افراتفری ہے 'غنڈہ گردی ہے 'لاقانونیت پیدا ہو گئی ہے



سردار عبدالقیوم اور محمد خان جونیجو